درس ۱۳

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب۔ درس نمبر ۱۳

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 5869501-03

نام کتاب ـــــــــــ اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام (درس نمبر 13)

طبع اول (جون 2000ء) ـــــــــــ 1100

طبع ثانی (ستمبر 2003ء) ـــــــــــ 2200

ناشر ـــــــــــ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مقام اشاعت ـــــــــــ 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 03-5869501

مطبع ـــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ـــــــــــ 15 روپے

درس ۱۳

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ...... اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا۝ ﴾ (آیات ۲۳-۴۰)

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں ہو رہا ہے اس کا تیرھواں سبق سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ پر مشتمل ہے۔ یہ آیاتِ مبارکہ اس سورۃ کے تیسرے اور چوتھے رکوع پر مشتمل ہیں۔ اس سبق کا عنوان یا موضوع ہے "اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام۔"

سابقہ مباحث سے ربط و تعلق

اس درس پر گفتگو کے آغاز سے قبل اگر ہم ان مضامین کا مختصر طور پر اعادہ کر لیں جو اس سے پہلے دروس میں بیان ہو چکے ہیں تو مباحث کی کڑیاں جوڑنے میں آسانی ہو گی۔ مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل تھا، جن میں اُخروی نجات کے چار ناگزیر لوازم یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا بیان تھا۔ دوسرے حصے میں پانچ سبق تھے جن کا مرکزی موضوع "ایمان" تھا۔ تیسرے حصے میں "عمل صالح" کی تشریح و توضیح چل رہی ہے۔ یعنی اس حصہ میں قرآنی تعلیمات کے عملی پہلو کا بیان ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی

کہ انفرادی طور پر ایک بندۂ مومن کی سیرت و کردار میں اللہ تعالیٰ کو کون سے اوصاف محبوب ہیں۔ اس کے لئے ہم نے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات اور سورۃ المعارج کی ہم مضمون آیات کے حوالے سے یہ سمجھا کہ انفرادی سیرت کی تعمیر کے ضمن میں قرآن مجید کیا اصول بیان کرتا ہے اور اس کی کیا اساسات معین کرتا ہے۔ پھر سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں ہم نے پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت یعنی علامہ اقبال کے "مردِ مومن" اور قرآن مجید کی اصطلاح میں "عباد الرحمٰن" کی سیرت و کردار کے خد و خال کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف پہلے قدم یعنی خاندانی زندگی اور عائلی زندگی کے ضمن میں ہم نے پوری سورۃ التحریم کا مطالعہ کیا۔

اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھ رہے ہیں۔ خاندانوں سے معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے ہم سماج سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس معاشرے کے ضمن میں قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے! بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ قرآن مجید کی رُو سے وہ سماجی و معاشرتی اقدار (Soicial Values) کونسی ہیں جنہیں اسلام پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کی ترویج و تنفیذ ہو' انہیں معاشرے میں رائج کیا جائے اور اس کے برعکس وہ سماجی برائیاں (Social Evils) کونسی ہیں کہ جنہیں اسلام ناپسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کو معاشرے سے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا جائے' ان کا استیصال ہو' ان کو معاشرے میں پنپنے نہ دیا جائے۔ یہ مضامین ہیں جو ان اٹھارہ آیات میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔

تورات کے "احکام عشرہ" کا خلاصہ

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ سورۂ بنی اسرائیل قرآن مجید کے قریباً وسط میں وارد ہوئی ہے۔ پندرھویں پارے کا آغاز اسی سورۂ مبارکہ سے ہوتا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے ابتداء اور اختتام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات کا خلاصہ ہے اور درمیان میں یعنی تیسرے اور چوتھے رکوع میں تورات کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حبر الامت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان آیات میں

تورات کے احکامِ عشرہ (Ten Commandments) کا خلاصہ اور نچوڑ بیان کر دیا گیا ہے۔

اسلامی حکومت کے لئے رسول اللہ ﷺ کا منشور

زمانہ نزول کے اعتبار سے سورۂ بنی اسرائیل مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے ۔ چنانچہ اس کی پہلی آیت میں واقعۂ معراج کا ذکر ہے ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ ﴾ یعنی "پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے"۔ درمیان میں بھی ایک مقام پر معراج کے واقعہ کا تذکرہ ہے۔ معراج ۱۳ نبوی میں ہوا۔ لہٰذا یہی اس سورۂ مبارکہ کا زمانہ نزول ہے گویا کہ ہجرت سے متصلاً قبل۔

مکہ میں مسلمان کمزور تھے، وہاں کفر کا پوری طرح غلبہ تھا، لیکن ہجرت کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مدینہ منورہ میں ایک آزاد اسلامی معاشرہ وجود میں آنے والا تھا یوں کہئے کہ ایک اسلامی حکومت قائم ہونے والی تھی، جہاں مسلمان اپنی آزادی اور اختیار سے جن چیزوں کو چاہیں رائج کریں، ان کی تنفیذ کریں، انہیں promote کریں اور جن جن چیزوں کو چاہیں ان کو روکیں، ان کو مٹائیں اور ان کا استیصال کریں۔ اس اعتبار سے جدید اصطلاح میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان آیاتِ مبارکہ میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا منشور (Manifesto) بیان ہو رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ حضور ؐ کو غلبہ عطا فرمائے تو اسلامی ریاست میں آپؐ کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ جیسا کہ سورۃ الحج میں وارد ہوا : ﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (آیت ۴۱) "وہ لوگ جنہیں اگر ہم زمین میں غلبہ عطا فرمائیں تو وہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے، نظامِ زکوٰۃ قائم کریں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے اور بدیوں سے روکیں گے"۔ گویا یہ اسی آیت کی شرح ہے جو سورۂ بنی اسرائیل کی زیر مطالعہ آیات میں ہمارے سامنے آ رہی ہے کہ وہ اوامر کون سے ہیں کہ جن کی وہاں ترویج

و تنفیذ ہوگی اور وہ نواہی کون سے ہیں جن کا اس معاشرے میں استیصال کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے اس سبق کی بڑی اہمیت ہے کہ ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلامی حکومت کے قیام کیلئے نبی اکرم ﷺ کا منشور ہے۔

آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ

اب ہم ان آیاتِ مبارکہ کے متن کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ کرتے ہیں تاکہ پہلے بیک نظر ہمارے سامنے وہ مضامین آ جائیں جو ان آیاتِ مبارکہ میں آ رہے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ایک پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ ﴾

"اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مت بندگی کرو کسی کی سوائے اس کے' اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔"

﴿ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ ﴾

"اگر پہنچ جائیں تمہارے پاس بڑھاپے کی عمر کو ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تو انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے نرمی اور ادب کے ساتھ بات کرو"

﴿ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ ﴾

"اور ان کے سامنے اپنے شانے نیازمندی اور ادب کے ساتھ جھکا کر رکھو اور یہ دعا کیا کرو کہ اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے پالا پوسا جبکہ میں چھوٹا سا تھا۔"

﴿ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝ ﴾

"تمہارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ کہ تمہارے جی میں ہے۔ اگر تم واقعتاً نیک ہوئے تو یقیناً اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کے حق میں بہت مغفرت کرنے والا' بخشنے والا

ہے"۔

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ ﴾

"اور رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو' اور محتاج اور مسافر کو بھی (اپنے مال میں سے دو) اور اپنی دولت کو نام و نمود اور نمائش کے لئے نہ اُڑاؤ"۔

﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ ﴾

"یقیناً جو لوگ اپنی دولت نمود و نمائش کے لئے اڑاتے ہیں' وہ شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا (اور نافرمان) ہے"۔

﴿ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ ﴾

"اور اگر تمہیں ان سے اعراض کرنا ہی پڑے' اس لئے کہ تم اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو تو ان سے بات نرمی سے کرو"۔

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ ﴾

"اور اپنے ہاتھ کو نہ تو اپنی گردن کے ساتھ باندھ رکھو اور نہ اس کو بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ پھر تمہیں بیٹھ رہنا پڑے ملامت زدہ ہو کر اور عاجز بن کر"۔

﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝ ﴾

"یقیناً تیرا رب رزق کو کشادہ بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے بندوں کے حالات سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے"۔

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ ﴾

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو' ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور خود تمہیں بھی' یقیناً ان کو قتل کرنا بہت بڑی خطا ہے"۔

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾

"اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو ــــ یقیناً وہ بڑی بے حیائی اور بہت ہی گھناؤنا راستہ ہے"۔

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ ﴾

"اور نہ قتل کرو کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ' اور جو کوئی مظلومانہ قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار عطا فرمایا ہے' پس چاہئے کہ وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے' یقیناً اس کی مدد کی جائے گی"۔

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ ﴾

"اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو مگر بہترین طور پر تا آنکہ وہ بالغ ہو جائے' اور عہد کو پورا کرو' یقیناً عہد کے بارے میں بازپرس ہو گی"۔

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾

"اور جب ماپ کرو تو پیمانہ پورا بھرو اور جب تولو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو' یہی عمدہ طرزِ عمل ہے اور انجامِ کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"۔

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ ﴾

"اور اس چیز کی پیروی مت کرو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے' یقیناً سماعت' بصارت اور قلب و ذہن کی جو استعدادات تمہیں عطا کی گئی ہیں ان کے بارے میں بازپرس ہو گی"۔

﴿ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ ﴾

"اور زمین میں اکڑ کر مت چلو' یقیناً تم نہ تو زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ ہی اونچائی اور بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو"۔

﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا۝﴾

"ان تمام باتوں میں جو برائی کے پہلو ہیں وہ تمہارے رب کو ناپسند ہیں"۔

﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا۝﴾

"(اے نبی ﷺ) یہ ہیں وہ باتیں جو آپؐ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہیں از قسم حکمت و دانائی۔ اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود مت ٹھہرا بیٹھنا کہ پھر جھونک دیئے جاؤ جہنم میں ملامت زدہ ہو کر دھکے دیئے جا کر"۔

﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا۝﴾

"کیا تمہارے رب نے تمہیں تو چن لیا ہے بیٹوں کے لئے اور خود ملائکہ کی صورت میں بیٹیاں اختیار کر لی ہیں؟ یقیناً تم ایک بہت بڑی بات کہہ رہے ہو"۔

قرآن میں مضامین کی تکرار اور اس کی حکمت

ان آیات کے ترجمے سے جو مضامین ہمارے سامنے آئے ان میں سے اکثر مضامین اس سے قبل اس منتخب نصاب کے مختلف اسباق میں آ چکے ہیں۔ مثلاً شرک کی مذمت و ممانعت اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ اقرباء' یتامٰی اور مساکین کے ساتھ نیک سلوک اور ان کی احتیاجوں کے رفع کرنے میں اپنا مال خرچ کرنے کے مضامین آیۂ بر میں بھی آئے (جو ہمارا درس نمبر دو تھا) اور پھر سورۃ المعارج میں بھی یہ آیت وارد ہوئی : ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۝﴾ اسی طرح قتل ناحق کی مذمت و ممانعت سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں آ چکی ہے۔ زنا کی شناعت کا ذکر بھی اسی سبق میں آ چکا ہے۔ ایفائے عہد کی تاکید آیۂ بر میں بھی آئی اور اس کا ذکر سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی ہم مضمون آیات میں بھی آیا ہے۔ تکبر اور غرور کی مذمت اور تواضع' فروتنی اور حلم کی تلقین سورۂ لقمان کے سبق میں بھی آ چکی ہے اور یہی مضمون سورۃ الفرقان میں مثبت پیرائے میں بایں الفاظ آ چکا ہے ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ یعنی "اللہ کے محبوب بندے

وہ ہیں جو زمین پر آہستگی اور فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں"۔

قرآن حکیم میں مضامین کی تکرار کے ضمن میں چند باتیں قابل توجہ ہیں : قرآن مجید میں اگر مضامین کی تکرار ہوتی ہے تو اس سے اولاً تو اِن مضامین کی اہمیت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ ثانیاً تکرارِ محض کہیں نہیں ہوتی' تکرارِ محض کلام کا عیب شمار ہوتا ہے اور قرآن مجید اس عیب سے پاک ہے۔ اگر کہیں کوئی مضمون دوہرا کر آتا ہے تو اسلوب بدلا ہوا ہوتا ہے۔ وہی بات کہ ع

اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!

اس اندازِ بیان اور اسلوب کے فرق سے اس کلام کی دل نشینی' دل آویزی' اثر انگیزی اور اثر پذیری میں اضافہ ہوتا ہے۔ ثالثاً بعض مقامات پر ایسا ہوتا ہے کہ موضوع تو مشترک ہوتا ہے لیکن کہیں وہ انفرادی سیرت و کردار کے ضمن میں آرہا ہوتا ہے اور کہیں وہی بات معاشرتی اور سماجی اقدار کی حیثیت سے سامنے لائی جارہی ہوتی ہے۔ رابعاً جہاں بھی کوئی مضمون دوسری بار آتا ہے تو اگر اسے نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو وہاں کوئی نہ کوئی نیا پہلو مِل جاتا ہے۔ چنانچہ اگر قرآن مجید میں کہیں تکرار محسوس ہو تو آپ ان چاروں میں سے کسی نہ کسی ایک بات کو وہاں موجود پائیں گے۔

ان سب باتوں کو جمع کر کے سورۃ الزمر کی ایک آیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جس میں قرآن مجید اپنا تعارف ان الفاظ مبارکہ میں کراتا ہے ﴿كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مضامین باہم مماثل ہیں اور دوہرا دوہرا کر آتے ہیں۔ بقول اقبال ع

شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں مری بات!

اگر ایک انداز سے بات سمجھ میں نہیں آئی تو شاید دوسرے انداز سے سمجھ میں آجائے۔

زیر درس آیات کے متن اور ترجمہ سے ان آیات مبارکہ کے مضامین کا ایک اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اب ہم ان میں سے اہم نکات کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

شرک کی مذمت اور ممانعت

سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان آیات کے آغاز میں بھی شرک کی مذمت اور ممانعت ہے اور ان کا اختتام بھی اسی مضمون پر ہو رہا ہے۔ گویا وہ تمام اوصاف یا وہ تمام اقدار جو ان آیات میں بیان ہو رہی ہیں ان کے لئے توحید باری تعالیٰ ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح ہم نے سورۃ المومنون کی آیات میں دیکھا تھا کہ انفرادی سیرت کی تعمیر کے ضمن میں آغاز بھی نماز سے ہوا تھا ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ ﴾ اور پھر اختتام بھی نماز کے ذکر پر ہوا تھا ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○ ﴾ اور یہی اسلوب سورۃ المعارج کی ہم مضمون آیات میں ملاحظہ کیا تھا' بعینہٖ یہ بات ہمیں یہاں توحید کے بارے میں نظر آ رہی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چونکہ اسلام دین توحید ہے اور توحید کی ضد شرک ہے' لہٰذا اسلام جو بھی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے اس میں توحید کو مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور شرک کا مکمل استیصال یعنی جہاں شرک کا شائبہ بھی نظر آئے اسے محو کرنا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اس لئے کہ کوئی بھی معاشرہ اگر اپنے بنیادی نظریہ اور اپنے اساسی فکر کے خلاف کسی چیز کو در آنے کا موقع دے گا تو ظاہر بات ہے کہ اس نے اس معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ چنانچہ یہاں ابتداء میں فرمایا : ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾ بڑا فیصلہ کن انداز ہے کہ "تیرے رب نے طے فرما دیا ہے کہ مت بندگی کرو کسی کی سوائے اس کے"۔ ...اختتام پر بھی توحید ہی کا مضمون ہے' البتہ انداز مختلف ہے : ﴿ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ یعنی "اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ ٹھہرا بیٹھنا"....بات ایک ہے لیکن اسلوب جدا۔

یہ دونوں باتیں تو فی الحقیقت شرک فی العبادت کی نفی کر رہی ہیں' مگر دنیا میں شرک کی ایک اور قسم بھی موجود رہی ہے' جسے شرک فی الذات کہتے ہیں یعنی کسی کو خدا کا بیٹا یا بیٹی قرار دے دینا۔ جیسا کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ اسی طرح اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں

قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے جتنے بُت تھے ان کے نام مؤنث ہیں' جیسے "لات" الٰہ کا مؤنث ہے "العزیٰ" یہ العزیز کا مؤنث ہے اور "المنات" المنان کا مؤنث ہے۔ انہوں نے فرشتوں کو اپنا معبود مانا اور ان کے بارے میں یہ سمجھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بڑے ہی لطیف پیرائے میں تنقید کی جا رہی ہے کہ ہوش مندو! تم نے اللہ کو الاٹ بھی کیں تو بیٹیاں!! ﴿ اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴾ "کیا تمہارے رب نے تم کو تو چن لیا ہے بیٹوں کے لئے؟" ﴿ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ﴾ "اور اپنے لئے فرشتوں کی صورت میں بیٹیاں اختیار کر لیں!" ﴿ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴾ "جان لو کہ یہ بات جو تم اپنی زبان سے نکال رہے ہو' یہ بہت بڑی بات ہے"۔ یہ اللہ کی جناب میں بہت بڑی جسارت ہے' بہت بڑی گستاخی ہے۔

حقوق والدین کی خصوصی اہمیت

دوسرا نکتہ ہے ﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی آ چکا ہے ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ﴾ نیز قرآن مجید میں متعدد مقامات اور بھی ہیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے حقوق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس مضمون کی خصوصی اہمیت کیا ہے؟ اگر آپ ذرا غور کریں گے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ جسے ہم معاشرہ یا سماج کہتے ہیں وہ خاندانوں کا اجتماع ہے' بہت سے خاندان مل کر معاشرے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ گویا معاشرے کی اکائی خاندان ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر خاندان مستحکم ہو گا' اس کا نظام مضبوط ہو گا تو پورا معاشرہ بھی مستحکم ہو گا اور اگر خاندان کمزور پڑ جائے تو پورے معاشرے میں بھی اضمحلال اور فساد رونما ہو گا۔ اس لئے کہ اگر اینٹیں کچی ہوں گی تو فصیل بھی کچی ہو گی اور اگر اینٹیں پکی ہوں اور ہر اینٹ اپنی جگہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہو تو فصیل بھی مضبوط ہو گی۔ ایک مشہور مفکر نے ایک بڑی عجیب بات کہی ہے کہ مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کے مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کوئی تہذیب اور کوئی تمدن اُس وقت تک زوال سے دوچار نہیں ہوتا جب تک اس میں خاندان کا ادارہ کمزور نہ پڑ جائے۔ یہ گویا تہذیب

و تمدن کے اضمحلال اور زوال کا نقطۂ آغاز ہے۔
اب اگر ہم غور کریں تو خاندان کے ادارے کے تین اہم گوشے ہیں۔ ایک گوشہ شوہر اور بیوی کے باہمی ربط و تعلق کا ہے، دوسرا گوشہ والدین اور اولاد کے باہمی ربط و تعلق کا ہے اور تیسرا گوشہ بہنوں اور بھائیوں کے درمیان رشتۂ اخوت سے متعلق ہے۔ خاندان کے ادارے کے اِن اَبعادِ ثلاثہ (Three Dimensions) کے مابین صحیح توازن قائم رہے گا تو خاندان کا نظام مستحکم ہوگا۔ جہاں تک شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے اس موضوع پر ہم سورۃ التحریم میں قرآن مجید کی بنیادی رہنمائی قدرے تفصیل کے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔

اب یہاں یہ سمجھئے کہ اگر کسی معاشرے میں والدین سے بے رُخی عام ہو جائے تو یہ خاندانی نظام کو مضمحل کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہوگا۔ اگر والدین کو یہ اعتماد نہ ہو کہ بڑھاپے میں ہماری اولاد ہمارا سہارا بنے گی تو ان میں بھی خود غرضی پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر وہ بھی اپنے آپ کو اولاد میں کلیتاً invest کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے اور اپنے مستقبل کے لئے کچھ بچا بچا کر رکھیں گے۔ لیکن اگر کسی معاشرے میں یہ قدر (Value) موجود ہے کہ بوڑھے والدین کی اولاد اُن کا سہارا بنتی ہے، ان کی ذمہ داریوں کو پوری طرح نباہتی اور ادا کرتی ہے تو والدین بھی اپنی جوانی کے دور کی ساری توانائیاں اپنی اولاد پر کھپاتے اور invest کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں آج بھی الحمدللہ یہ رنگ بڑی حد تک موجود ہے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس صورت حال دیکھنا چاہیں تو آپ یورپ اور امریکہ جاکر وہاں کے معاشروں کا مشاہدہ کیجئے۔ وہاں موجودہ دور میں بڑھاپا سب سے بڑی لعنت سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ وہاں حکومت کی سطح پر بوڑھوں کے لئے ادارے قائم ہیں، ان کی دیکھ بھال ہو رہی ہے، لیکن وہ جو محبت کی پیاس ہوتی ہے اس پیاس کی تسکین کا ان اداروں میں کوئی سامان نہیں ہے۔ وہ اپنی اولاد کو دیکھنے تک کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔ ان ممالک میں کرسمس کی اہمیت اب یہ رہ گئی ہے کہ بوڑھے والدین ان اداروں میں اپنے دل میں یہ تمنا اور توقع لئے منتظر رہتے ہیں کہ شاید اس کرسمس پر ہمارے بچے ہم سے ملنے آئیں اور اس موقع پر ہم اپنی اولاد کی شکل دیکھ سکیں۔

اس کے برعکس نظام ہے جو اسلام نے دنیا کو دیا ہے۔ اس میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر اللہ کے حقوق کے متصلاً بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا' قرآن حکیم میں تکرار محض کہیں نہیں ہوتی۔ سورۂ لقمان میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دیتے ہوئے والدہ کا ذکر بطورِ خاص کیا گیا تھا ﴿حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ اور یہاں ضعیفی کی وہ عمر خاص طور پر پیش نظر ہے جس کو قرآن مجید میں ارذل العمر قرار دیا گیا ہے' یعنی عمر کا وہ حصہ جو بڑا ہی کمزوری اور بے چارگی والا حصہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے خود عمر کے اس حصے سے اللہ کی پناہ طلب کی ہے۔ عمر کے اس حصے میں ایک تو بوڑھے والدین کے احساسات زیادہ نازک ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اکثر و بیشتر ان کے فہم میں بھی کمی آجاتی ہے۔ جیسے سورۂ یٰسین میں فرمایا : ﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ ان کی ذہنی توانائیاں پہلی سی نہیں رہتیں اور ان کے فہم و فکر میں اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا مشاہدہ ہو گا کہ بڑھاپے میں انسان میں بچپن کی سی خواہشات عود کر آتی ہیں اور وہ کچھ اسی طرح کی فرمائشیں کرنے لگتا ہے۔ ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ اولاد کے لئے بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ وہ ان کی سب فرمائشیں پوری بھی نہیں کر سکتے' کہیں نہ کہیں روک لگانی پڑے گی' ان کی بات رد کرنا پڑے گی۔ اس کے پیش نظر یہاں حکم دیا جا رہا ہے کہ ان سے جب بھی بات کرو تو نرمی اور ادب کو بہرحال ملحوظ رکھو۔ سینہ تان کر بات نہ کرو' انہیں جھڑکو مت' ملامت نہ کرو۔ اور اگر ان کی کسی بات کو پورا نہیں کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کرو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کے سامنے اپنے شانے جھکا کر رکھو۔ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ آج یہ مجھ سے سینہ تان کر بات کر رہا ہے درانحالیکہ یہ کبھی اس حال میں تھا کہ اس کا وجود بھی ہمارا مرہونِ منت تھا' اس کی پرورش ہمارے ذمہ تھی اور ہم اپنا پیٹ کاٹ کر اس کی ضروریات کو مقدم رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فرمادیا کہ اللہ سے بھی دعا کرتے رہا کرو کہ پروردگار' مجھ سے اگر کوئی کوتاہی ہو ہی جائے تو تُو بخشنے والا ہے۔ اور والدین کے تمام حقوق میں خود ادا کر بھی نہیں سکتا' ان کے احسانات کا جو بارِ گراں میرے کاندھوں پر ہے ان کا حساب میں نہیں چکا سکتا لہٰذا تجھ ہی

ہے استدعا کر رہا ہوں : ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا﴾ "پروردگار! تو اِن پر رحم فرما جیسے انہوں نے مجھے پالا پوسا جبکہ میں چھوٹا تھا"۔

ساتھ ہی یہ تسلی بھی دے دی کہ اگر استثنائی حالات میں کبھی تمہیں ان کی بات کو رد کرنا پڑ جائے تو ایک سعادت مند بیٹے پر اس کا جو احساس طاری ہو گا اور جو کوفت اسے ہوگی اس کے ازالے کے لئے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، تمہارا رب صرف ظاہر کو نہیں جانتا بلکہ وہ تو اسے بھی جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے ﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوْسِكُمْ﴾ تم نے اگر کسی وقت اپنے والدین کی فرمائش کو رد کیا ہے تو تمہاری کیا مجبوری ہے، تمہارے کیا حالات ہیں، تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ اگر تم اپنی قلبی کیفیت کے اعتبار سے درست ہو اور نیک نیت ہو تو اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی مغفرت فرمانے والا ہے : ﴿اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝﴾

رشتہ دار، مسکین اور مسافر کا حق

اب تیسرے نکتے کی طرف آیئے۔ ویسے یہ مضمون بھی اس سے پہلے آچکا ہے، لیکن یہاں ایک نئی شان سے آ رہا ہے، فرمایا : ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ دیکھئے، یہ بڑی فطری ترتیب ہے۔ خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے کے بعد اب انسان کے حسن سلوک کا دائرہ بڑھنا چاہئے اور ظاہر بات ہے کہ "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ" کے اصول کے مطابق جو سب سے قریب ہے وہ سب سے پہلے حسن سلوک کا مستحق ہے۔ یعنی جو فطری طور پر مقدم ہے اسی کو مقدم رکھنا ہو گا۔ پس جو قرابت دار اور رشتہ دار ہیں ان کا حق حسن سلوک میں فائق اور مقدم رہے گا۔ پھر اس دائرے میں معاشرے کے محروم افراد کو شامل کرنا ہو گا، جن میں مساکین، مجبور، یتیم اور مسافر سبھی شامل ہیں۔ اس طرح تمہارے حسن سلوک کا دائرہ بڑھتا چلا جانا چاہئے۔

"تبذیر" کی ممانعت اور اس کی شناعت

لیکن اگر کوئی شخص اپنی دولت کو نام و نمود، نمائش اور اللوں تللوں میں اڑا رہا ہے تو وہ اس خیر، اس نیکی اور اس بھلائی سے محروم رہے گا۔ لہٰذا اس کے ساتھ ہی تبذیر

کی ممانعت کی گئی جو ادائے حقوق کی ضد ہے۔ گویا ایک ہی آیتِ مبارکہ میں معاشرتی و سماجی اعتبار سے اخراجات کی دو انتہاؤں کو جمع کردیا گیا اور یہ رہنمائی دے دی گئی کہ انسان کو چاہئے کہ ابنائے نوع پر اپنی دولت مندی کا رعب گانٹھنے کے لئے نام و نمود اور نمائش کے فضول کاموں پر خرچ کرنے کے بجائے اسے ان کی ضروریات اور احتیاجات کو رفع کرنے کا ذریعہ بنائے۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر فرمایا ﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴾ یعنی اپنی دولت کو اَللوں تَللوں میں مت اڑاؤ۔

یہاں نوٹ کیجئے کہ اس سلسلے میں سورۃ الفرقان میں لفظ "اسراف" آیا تھا لیکن یہاں اسراف کے بجائے "تبذیر" آیا ہے۔ اگرچہ اسراف اور تبذیر دونوں قابل تحذیر اور قابل مذمت ہیں، لیکن ان کے مابین فرق ہے! اسراف انسان کا اپنی کسی جائز ضرورت کو پورا کرنے میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا ہے، مثلاً خوراک ہماری ضرورت ہے لیکن ضرورت سے آگے بڑھ کر انواع و اقسام کے کھانوں کو دسترخوان کی زینت کا معمول بنا لینا اسراف کے ذیل میں آئے گا۔ کپڑے پہننا اور تن ڈھانپنا ہماری ضرورت ہے، لیکن بیس بیس اور تیس تیس جوڑوں سے الماریاں بھری ہوئی ہوں تو یہ اسراف ہے۔ اسراف کی ضد ہے بخل، یعنی اللہ تعالیٰ نے کشادگی دے رکھی ہے، آسودگی اور خوش حالی ہے، لیکن انسان دولت کو سینت سینت کر رکھ رہا ہے، دوسروں پر تو کیا خرچ کرے گا، خود اپنی جائز ضرورتوں میں بھی بخل سے کام لیتا ہے۔ یہ انسان کے ذاتی اور نجی اخراجات کی دو انتہائیں ہیں۔ چنانچہ انسان کے ذاتی سیرت و کردار کے اوصاف کے ضمن میں سورۃ الفرقان میں اس بات کو مثبت انداز میں بیان کردیا گیا ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ یعنی "(عباد الرحمٰن) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں (کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کریں) اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں (کہ حقیقی ضرورت کے معاملے میں بھی خرچ کرتے ہوئے دل میں گھٹن محسوس کریں) بلکہ ان کا معاملہ اور رویہ اعتدال کا رہتا ہے"۔ اب ذرا غور کیجئے کہ تبذیر کیا ہے؟ تبذیر اس خرچ کو کہا جاتا ہے جس کی سرے سے کوئی حقیقی ضرورت ہوتی ہی نہیں۔ صرف نمود و نمائش کے لئے، لوگوں پر اپنی دولت کا رعب گانٹھنے کے لئے اور

اپنی دولت مندی کی دھونس جمانے کے لئے دولت خرچ کی جاتی ہے' جیسے ہمارے اہل ثروت کے یہاں شادی کی تقاریب کے موقع پر ہوتا ہے۔

یہاں تبذیر کی نہایت شدید مذمت بیان کی گئی ہے۔ فرمایا گیا کہ یہ مبذرین (فضول خرچی کرنے والے) دراصل شیطانوں کے بھائی ہیں۔ غور کیجئے ایسا کیوں کہا گیا؟ شیطان انسانوں پر جو سب سے بڑا حربہ آزماتا ہے' خصوصاً معاشرتی' سماجی اور تمدنی سطح پر' وہ انسانوں کے دلوں سے باہم محبت واخوت کے رشتوں اور جذبات کو ختم کرکے اس میں نفرت وعداوت کے بیج بو دیتا ہے۔ چنانچہ شراب اور جوئے کے بارے میں سورۃ المائدہ کی آیت ۹۱ میں فرمایا گیا: "شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے دل میں بغض وعداوت اور دشمنی کے بیج بو دے"۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تبذیر سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑے سرمایہ دار کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے' اس کا عالی شان بنگلہ جگمگ جگمگ کر رہا ہے' اس کے چپے چپے پر اور درختوں کے ایک ایک پتے کے ساتھ روشنی کے قمقمے لگا دیئے گئے ہیں' پوری کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ اسی کوٹھی میں اس کا کوئی شوفر بھی ہے' کوئی خانساماں بھی ہے' اس کے بنگلے میں مختلف کاموں کے لئے بہت سے دوسرے ملازمین بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان ملازمین میں سے کسی کی جوان بچی اس لئے بیٹھی ہوئی ہو اور اس کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکتے ہوں کہ بچی کی شادی کے ضمن میں جو کم سے کم ضروری اخراجات ہوں' ان کے لئے بھی اس کے پاس پیسہ نہ ہو۔ اب آپ خود فیصلہ کرلیجئے کہ دولت کے اس طرح اظہار کو دیکھ کر کیا آپس میں محبت اور یگانگت کا احساس پیدا ہوگا؟ اس سے تو نفرت وعداوت کے بیج ہی دلوں میں بوئے جائیں گے۔ "haves" اور "have nots" کا شعور اور طبقاتی فرق وتفاوت کے احساسات وجذبات کے ادراک کو دلوں میں پختہ کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر بات یہی ہے کہ دولت مند اپنی دولت کا اس طریقے سے اظہار کریں' اس کی نمائش کریں۔ اس طرح دلوں کے اندر نفرت وعداوت کا لاوا پکتا رہتا ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا﴾ "یقیناً مبذرین (نام ونمود اور نمائش کے لئے اپنی دولت اڑانے والے) شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان تو

ہے ہی اپنے رب کا بے حد ناشکرا"۔

اگلی آیت میں ایک اور بات کی تلقین فرمائی کہ اگر تمہیں کبھی اپنے قرابت داروں' ضرورت مندوں یا سائلین سے کسی وقت معذرت کرنا ہی پڑے' اس لئے کہ تم خود بھی (فراغت اور کشادگی کے لئے) اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو' تو بات نرمی کے ساتھ کرو' ان کو جھڑکو نہیں' جیسا کہ سورۃ الضحیٰ میں خود حضور ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلاَ تَنْهَرْ﴾ یہاں ایک معاشرتی اخلاقی قدر (value) کے طور پر ہدایت دی جا رہی ہے ﴿وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلاً مَّيْسُوْرًا﴾

پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ اس خیر اور بھلائی کے کام میں بھی اعتدال و توازن کی ضرورت ہے۔ ﴿وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ﴾ نہ تو ایسا ہو کہ ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہو' یہ بخل کے لئے ایک تعبیر ہے۔ ﴿وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ "اور ایسا نہ ہو کہ ہاتھ بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے" اس میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے۔ آدمی جذبات میں آ کر کسی وقت اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بعد میں پچھتائے ﴿فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ اس کی اپنی اولاد فقیروں اور بھکاریوں کی صورت اختیار کر لے۔ اس لئے اس میں بھی توازن اور اعتدال درکار ہے۔

اس مضمون کا اختتام اس آیت مبارکہ پر ہوتا ہے ﴿اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا﴾ "بے شک تیرا رب ہی کھول دیتا ہے روزی جس کے لئے چاہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا' ان کو دیکھنے والا ہے"۔ اس آیت کے ذریعے سے دراصل یہ اصول بیان کر دیا گیا کہ کسی کی کشادگی و تونگری اور کسی کی تنگی اور مفلسی کے ذمہ دار تم نہیں ہو اور نہ یہ واقعتاً تمہارے بس کی بات ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کامل اور حکمت بالغہ کی بنا پر کرتا ہے اور فراخی و تنگی میں بھی بندے کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔

قتل اولاد کی ممانعت

اگلی آیت میں قتل اولاد کی ممانعت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے: ﴿وَلاَ تَقْتُلُوْا

اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًا O ﴾ "اور اپنی اولاد کو مفلسی اور تنگ دستی کے خوف سے مت قتل کرو۔ ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی (دے رہے ہیں اور دیں گے)۔ یقیناً ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے"۔

ایامِ جاہلیت یعنی بعثت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے قبل عرب میں یہ قبیح رواج تھا کہ پیدائش کے فوراً بعد اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے کہ ان کا خرچ کہاں سے لائیں گے! گویا معاشی محرکات ان کو قتل اولاد جیسے ظالمانہ فعل پر آمادہ کرتے تھے۔ یہاں افلاس کے خوف سے قتل اولاد سے روکا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ رزق کے ٹھیکے دار تم نہیں ہو بلکہ اس کی پوری ذمہ داری اللہ پر ہے۔ وہی تمہیں رزق دیتا ہے اور وہی تمہاری آئندہ نسلوں کو بھی کھلائے گا۔ اولاد کا قتل ایک بہت بڑا گناہ ہے اور یہ فعل کبیرہ گناہوں میں شامل ہے ـــــ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ ہمارے اکثر علماء کرام نے معاشی محرکات کے تحت منع حمل کی تدابیر کو بھی تبعاً اسی "نہی" کے حکم میں شامل قرار دیا ہے اور کسی حقیقی و ناگزیر طبی ضرورت کے علاوہ صرف معاشی محرکات کے پیش نظر اسقاط حمل کو تو واضح طور پر قتل اولاد کے گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے۔

زنا کا مکمل سدِّباب

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَسَآءَ سَبِیْلًا O ﴾ (آیت ۳۲)

اس آیۂ مبارکہ میں زنا کی جس شدت کے ساتھ ممانعت وارد ہو رہی ہے' وہ لفظ "لَا تَقْرَبُوْا" سے ظاہر ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الفرقان میں بھی اس برائی کا ذکر آیا تھا' لیکن وہاں اسلوب مختلف تھا۔ وہاں عباد الرحمٰن کے اوصاف میں سے ایک اعلیٰ وصف یہ بیان کیا گیا کہ ﴿ وَلَا یَزْنُوْنَ ﴾ "وہ زنا نہیں کرتے" جبکہ یہاں انتہائی تاکیدی انداز سے نہی کے اسلوب میں حکم فرمایا جا رہا ہے کہ ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی ﴾ "زنا کے قریب تک نہ پھٹکو"۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی اور سماجی نظام میں اس سماجی برائی (Social Evil) کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت دور دور تک قدغنیں لگائی گئی ہیں تاکہ کوئی اس فحش کام کے قریب تک نہ پھٹک

سکے۔ اس لئے کہ ہمارے معاشرے اور ہمارے سماج میں عصمت و عفّت اور پاک دامنی (Chastity) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ایک اسلامی معاشرے میں ہر ممکن تدبیر اور احتیاط اختیار کی جائے گی کہ اس بدکاری کے جو بھی محرکات' اسباب اور داعیات ہو سکتے ہیں' اُن سب کے لئے بندشیں اور قدغنیں ہوں۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات میں بھی یہ وضاحت آئی ہے اور انجیل میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس لفظ زنا کی وسعت کو ظاہر کیا ہے کہ یہ مجرد وہ فعل نہیں ہے جو اس لفظ سے عام طور پر مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں الفاظ آتے ہیں ((زِنَا الْعَيْنَيْنِ النَّظَرُ)) "آنکھوں کی بدکاری نظربازی ہے"۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھوں کی بھی بدکاری ہے' پاؤں کی بھی بدکاری ہے' زبان کی بھی بدکاری ہے' کانوں کی بھی بدکاری ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے یہ تمام اعضاء و جوارح بدکاری میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ان تمام راستوں کو بند کیا گیا ہے جن کے باعث انسان کے اس جذبہ میں اشتعال و ہیجان پیدا ہو۔

یہ حقیقت پسندانہ ہدف معین کرنے کے بعد کہ ہمیں اپنے معاشرے میں عصمت و عفّت اور آبرو کی حفاظت کا اہتمام کرنا ہے اور بدکاری کا سدِّباب کرنا ہے' اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ اسلام میں اس کے لئے کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ قرآن مجید میں جو لفظ "زنا" آیا ہے اور جس نے ہمارے دین میں ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر لی ہے' اس ایک لفظ میں انگریزی زبان میں مستعمل تین الفاظ "fornication" "adultery" اور "rape" کا مفہوم موجود ہے۔

سب سے پہلے مثبت تدابیر کو لیجئے۔ ان میں اہم ترین مثبت تدبیر نکاح کو آسان بنانا ہے۔ اس لئے کہ اگر نکاح مشکل ہو' ہزاروں لاکھوں روپے کے انتظام کے بغیر نکاح نہ ہو سکے تو ظاہر بات ہے کہ شہوت کے جبلی تقاضے کی تسکین کے لئے بدکاری کی طرف رجحان ہو گا۔ جب تک جائز راستے کو کھولا نہ جائے اور اسے آسان نہ بنایا جائے اس وقت تک

ناجائز راستوں کو بند کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح پانی کے بہاؤ کے راستہ میں رکاوٹ ہو تو وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر ادھر اُدھر سے اپنا راستہ بنالیتا ہے' اسی طرح جنسی جذبے کی آسودگی کے جائز راستوں کو مشکل بنادیا جائے گا تو وہ ناجائز راستے تلاش کرے گا۔ لہٰذا اسلامی معاشرے میں زنا کے فعل قبیح کو روکنے والا اہم قدم تسہیلِ نکاح یعنی نکاح کو آسان بنانا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں نکاح کے لئے رسومات کا کوئی طومار نہیں۔ نہ ہی یہ نام و نمود کی نمائش اور دھوم دھڑکے کے اظہار کا کوئی ذریعہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہمارے یہاں بدقسمتی سے جو کچھ ہوتا ہے وہ درحقیقت ایک ملغوبہ ہے کہ ہم نے کچھ چیزیں تو اسلام کی اختیار کیں اور کچھ ہندووانہ معاشرت کی اپنالیں۔ ہماری آبادی کی اکثریت ان ہندوؤں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو ہندوستان میں آباد تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ نومسلم اپنی سابقہ رسومات' روایات اور رواجات بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ چنانچہ ہماری سماجی رسومات ایک کھچڑی ہے۔ ان میں ہندوانہ رسومات بھی شامل ہیں اور کچھ اسلامی افعال و اعمال کو بھی ہم نے ان میں داخل کرلیا ہے۔ ورنہ یہ دھوم دھڑکا' یہ جہیز دینے کی رسم اور یہ بارات کا تصور' جیسے ایک لشکر کہیں فتح کرنے کے لئے جارہا ہو اور پھر بہت سی دوسری لغو اور فضول رسومات' یہ سب کچھ ہندوانہ پس منظر کی حامل چیزیں ہیں۔ اسلام کا معاملہ نہایت سادہ طریق پر ایجاب و قبول ہے۔ اسلام نے شادی کا جشن (celebration) لڑکے کے ذمہ رکھا ہے کہ وہ دعوتِ ولیمہ کرے اور اپنی وسعت کے مطابق اپنے اعزہ و اقارب اور احباب کو اپنی خوشیوں میں شامل کرے۔ پس پہلی چیز تو یہ ہے کہ نکاح کے راستے کو آسان بنایا جائے تاکہ کسی بھی نوجوان کا دھیان غلط رُخ کی طرف نہ جائے۔

دوسرا مثبت طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جنسی جذبہ کو ہیجان اور اشتعال دینے والی تمام چیزوں کو سختی سے روک دیا گیا ہے۔ مثلاً شراب کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ انسان کے جنسی داعیہ کو اکساتی ہے۔ بعض دوسری منشیات کا اثر بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ اسلام ان کو حرام قرار دیتا ہے [illegible] نہ انسان بے خود ہو کر آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ [illegible]س کی خودی کی گرفت اس کے [illegible] وجود پر رہے' اس کا شعور معطل نہ ہو اور وہ جنسی

ہیجان سے شکست نہ کھاجائے' بلکہ ہر طرح سے بیدار رہے۔ اسی طرح رقص اور موسیقی کا بھی اسلامی معاشرے میں سدباب کیا گیا ہے' کیونکہ یہ بھی جنسی جذبے میں ہیجان پیدا کرتی ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک ان چیزوں کا سدباب نہیں ہو گا جن کے متعلق اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے سے بیخ و بُن کی طرح اکھڑ جائیں' اُس وقت تک زنا کی روک تھام ممکن نہیں ہو گی۔

پھر اسلام اپنے معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کو پسند نہیں کرتا بلکہ مردوں اور عورتوں کے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر ہے۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں فرمایا : ﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى ﴾ (آیت ۳۳) "اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور سابقہ دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو"۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورت ضرورت کے تحت بھی گھر سے نہیں نکل سکتی۔ اسے ضرورت کے تحت نکلنے کی اجازت ہے اور اس کے لئے بھی اسی سورۂ مبارکہ میں حکم موجود ہے کہ ﴿ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ (آیت ۵۹) یعنی وہ اپنے پورے وجود کو ایک چادر میں لپیٹ کر چہرے پر ایک پلو اس طرح لٹکالیا کریں کہ راستہ آسانی سے دیکھ سکیں اور حجاب کا تقاضا بھی پورا ہو سکے۔ یہاں میں نے "ضرورت کے تحت" کی جس قید کا ذکر کیا ہے وہ خود نبی اکرم ﷺ نے لگائی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا : ((قَدْ اَذِنَ اللّٰهُ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِكُنَّ)) "اللہ تعالیٰ نے تم (عورتوں) کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لئے گھر سے نکل سکتی ہو"۔ مذکورہ بالا آیاتِ مبارکہ میں بناؤ سنگار اور سج دھج کے ساتھ گھر سے نکلنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور اس فعل کو جاہلیت کا فعل قرار دیا گیا ہے۔

اسی سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ میں اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو ﴿ وَإِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ آیت کے اس حصے میں دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں' ایک یہ کہ اس میں لفظ "حجاب" آیا ہے جس کے معنی ہر پڑھا لکھا

شخص جانتا ہے کہ "پردہ" کے ہیں۔ دوسری یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا جا رہا ہے جن کے لئے ازواج مطہرات بمنزلہ روحانی ماں ہیں' جو اُمّہات المؤمنین ہیں' کہ ان سے بھی اگر کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگیں۔ یہ اسلوب اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ اسلام اپنے معاشرتی نظام میں مَردوں اور عورتوں کے مابین اختلاط کو روکنے کے لئے کیسی کیسی احتیاطیں ملحوظ رکھ رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ کہیں تنہائی میں نامحرم مَرد اور عورت اکٹھے نہ رہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہاں کہیں نامحرم مَرد اور عورت اکیلے ہوں گے وہاں تیسرا شیطان موجود ہو گا۔

اب آگے بڑھیے' لباس کے سلسلے میں ہماری تہذیب و تمدن کی جو روایات بنی ہیں وہ یوں ہی نہیں بن گئیں۔ اسلام نے ستر کا تصور دیا ہے اور اس کے لئے مستقل احکام دیئے ہیں۔ ستر سے مُراد جسم کے وہ حصے ہیں جو ڈھکے رہنے چاہئیں۔ ستر پوشی کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی جبلت و فطرت میں رکھا ہے۔ چنانچہ وحشی سے وحشی قبائل کو بھی آپ جا کر دیکھیں تو چاہے ان کا پورا جسم ننگ دھڑنگ ہو لیکن وہ پتّوں سے اپنے جسم کے کچھ حصوں کو چھپاتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ اسلام کی رُو سے مَرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنے کے نچلے حصہ تک ہے' اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنی چاہئے' یہ ہر حال میں ڈھکا رہنا چاہئے۔ چنانچہ کسی بیٹے کے سامنے باپ کے جسم کا بھی یہ حصہ نہیں کھلنا چاہئے۔ اسی طرح کسی بھائی کے سامنے اس کے بھائی کا بھی یہ حصہ نہیں کھل سکتا' یہ ستر ہے۔ اب عورت کے بارے میں دیکھئے۔ عورت کے بارے میں فرمایا گیا کہ ((اَلْمَرْءَۃُ عَوْرَۃٌ)) یعنی "عورت کا پورا جسم ستر ہے"۔ واضح رہے کہ لفظ "عورت" کا معنی ہی چھپانے کے قابل شے ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں عورتوں کے لئے لفظ "مستورات" استعمال ہوتا ہے' مستور ستر سے بنا ہے' اس کے معنی چھپی ہوئی شے کے ہیں۔ اس سے مستثنیٰ عورت کے جسم کے صرف تین حصے ہیں' چہرے کی ٹکیہ' ہاتھ اور ٹخنے سے نیچے پاؤں۔ یہ تین حصے ستر نہیں ہیں' باقی پورا جسم ستر ہے۔ عورت کا سر بلکہ بال بھی ستر میں داخل ہیں۔ اب سمجھئے کہ ستر کے کیا معنی ہیں! یہ کہ عورت کے جسم کے ان تین حصوں کے سوا کسی اور حصے پر اس کے بھائی یا باپ کی نگاہ بھی نہیں پڑنی چاہئے۔ یہ حصے ہر حال میں مستور رہیں گے۔ ستر

سے آگے کا معاملہ شوہر اور بیوی کے لئے ہے۔ البتہ کسی اشد اور ناگزیر صورتحال میں مرد یا عورت کے ستر کا کوئی حصہ طبیب' ڈاکٹر یا جراح کے سامنے کھولا جا سکتا ہے۔ باقی باپ' بیٹا' بھائی' بہن ان سب کے لئے ستر کی پابندی ضروری ہے۔

اسی ستر کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا کہ عورت کا ایسا لباس جس سے بدن چھلکتا ہو یا اس کی رعنائیاں نمایاں ہوتی ہوں ستر نہیں ہے' بلکہ ایسا لباس پہننے والی عورتوں کو حضورؐ نے "کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ" قرار دیا ہے' یعنی لباس پہننے کے باوجود یہ عورتیں عریاں ہیں۔ صحیح بخاری میں اُمّ المومنین حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک طویل روایت کے آخری الفاظ ہیں : ((رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ)) "دنیا میں کپڑے پہننے والی بہت سی عورتیں آخرت میں عریاں ہوں گی"۔ حدیث کے ان الفاظ سے ایسے باریک اور ایسے چست کپڑے پہننا مراد ہے جن سے جسم جھلکے یا عورت کی رعنائی کی چیزیں نمایاں ہوں۔ ایسی عورتوں کو کپڑے پہننے کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی قرار دیا ہے۔

ایک مزید چیز جو ہماری تہذیب کا جزو ہے اور جو ہماری معاشرت میں قرآن مجید کے حکم کے مطابق داخل ہوئی ہے وہ عورت کا دوپٹہ یا اوڑھنی ہے۔ ہماری معاشرت' ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کی اساسات کتاب اللہ میں موجود ہیں' اس کا تفصیلی ڈھانچہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بنایا ہے' پھر وہ ہماری معاشرتی زندگی میں پیوست ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دوپٹہ کا جو تصور اور استعمال ہے اس کا حکم بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ سورۃ النور میں فرمایا : ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ "اور عورتیں اپنے سینوں پر اپنی چادروں کے آنچل ڈال لیا کریں"۔ یعنی بکل مار لیا کریں۔ چاہے کسی خاتون نے کرتا پہنا ہوا ہے اور وہ موٹا بھی ہے' ڈھیلا بھی ہے' اس سے جسم تو ڈھک گیا' لیکن ابھی مزید کی ضرورت ہے' اور وہ دوپٹہ یا اوڑھنی ہے جسے اوڑھ کر عورت کا سر' سینہ' کمر سب اچھی طرح ڈھک جائیں۔ اگرچہ اِس دَور میں مغربی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے ہمارا تمدن اس اعتبار سے ایک ملغوبہ بن رہا ہے کہ کچھ اسلامی اقدار بھی موجود ہیں' کچھ مغربی اقدار بھی آگئی ہیں اور اس میں کچھ ہندووانہ رسوم و رواج بھی شامل ہیں'

ان سب کے امتزاج سے ہمارے معاشرے میں فی الوقت ایک عجیب کھچڑی پکی ہوئی ہے چنانچہ ہماری نوجوان لڑکیاں جس قسم کا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں وہ اس حکم کے منشاء کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ یہ بات گھر میں بھی پسندیدہ نہیں ہے کہ نوجوان لڑکی کا سینہ بغیر دوپٹے کے ہو۔ کون نہیں جانتا کہ عورت کے جسم میں سب سے زیادہ جاذبِ نظر اس کا سینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حکم دیا جا رہا ہے کہ ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾

پھر اسی سورۃ النور کی آیت ۳۰ میں تمام اہل ایمان مردوں اور آیت ۳۱ کی ابتداء میں تمام مسلمان خواتین کو غض بصر کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مردوں کے لئے فرمایا : ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ "(اے نبیؐ) مؤمن مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں"۔ اسی طرح عورتوں کے لئے فرمایا : ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ "اور (اے نبی) مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں"۔ ان آیات میں غض بصر سے مراد نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت ہے۔ یعنی مرد اپنی بیوی کے علاوہ کسی محرم خاتون کو بھی اور عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی محرم مرد کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھے۔ جب محرموں کے نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت کی جا رہی ہے تو غیر محرموں کے لئے خود بخود اس پابندی کا وزن بہت بڑھ جائے گا۔ چنانچہ اس قسم کی دیدہ بازی کو حدیث شریف میں آنکھ کے زنا سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ ایک طویل روایت میں ہے :
((اَلْعَيْنَانِ تَزْنِيَانِ وَ زِنَاهُمَا النَّظَرُ)) "آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نظربازی ہے"۔
ایک اور مشہور حدیث کا مفہوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سرخیلِ اتقیاء حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اے علی، کسی نامحرم پر اچانک اور بلا ارادہ پہلی نگاہ کا پڑ جانا معاف ہے، لیکن ارادتاً دوسری نگاہ ڈالنا قابل مواخذہ ہے"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ قرآن مجید ہمیں کیا احکام دے رہا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کیا ہیں۔ ان سب کے جو اثرات ہمارے تمدن پر مترتب ہوئے ہیں وہ بہت واضح ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ مسلمان عورت کا ساتر لباس کیسے وجود میں آیا! مسلمانوں کے گھروں کی تعمیر کا کیا مزاج بنا! آج کل کے کوٹھی نما

طرز تعمیر کے وجود کو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا' ورنہ مسلمان چاہے امیر ہوتا تھا چاہے غریب' گھر خواہ بڑا ہوتا تھا خواہ چھوٹا' اس میں زنانہ اور مردانہ حصے علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔ پہلے مردانہ حصہ آتا' پھر ڈیوڑھی ہوتی اور اس ڈیوڑھی سے آگے زنانہ حصہ ہوتا اور زنانہ حصے کے صحن کے چاروں طرف تعمیر ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کے زیر اثر اپنے تمدن میں اس طرز تعمیر کو ترقی اور نشو و نما دی ہے۔

الغرض اسلام نے محرکاتِ زنا کے سدباب کے لئے بہت دور رس اقدامات کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے بیان پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کا مقصود یہی ہے کہ بدکاری کے قریب بھی نہ پھٹکا جائے ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بے حیائی کا کام تو ہے ہی' یہ ایک بہت برا راستہ بھی ہے جس پر کوئی معاشرہ پڑ جائے تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اب غور کیجئے' اِس دور میں ایک طرف تو فرائڈ کا نظریہ ہے اور نفسیات کا کون سا طالب علم یہ نہیں جانتا کہ اس نے جنس کو کس قدر مؤثر عامل مانا ہے۔ اس کے فلسفہ کی رُو سے اس کے انسانی زندگی کے تمام تفصیلی ڈھانچہ میں جنسی جذبہ کہیں نہ کہیں کارفرما ہے اور اس کے اثرات کم و بیش موجود ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس کے فلسفہ کے مطابق اگر ایک باپ اپنی چھوٹی بچی کو پیار کرتا ہے اور ایک ماں اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لے کر اس کو چومتی ہے تو وہ اس کا محرک بھی جنس کو قرار دیتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ اسلام میں ستر و حجاب کی یہ پابندیاں اور قدغنیں شاید ثقافت' تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے پس ماندہ لوگوں کے لئے ہوں گی۔ یہ ہمارا ایک علمی و فکری تضاد ہے۔ فرائڈ نے اپنے نظریہ کی بنیاد اپنے تجربات و مشاہدات پر رکھی ہے اور یہ یقیناً گمراہی ہے اور اس میں نہایت مبالغہ ہے۔ لیکن اگر اس کا دسواں حصہ بھی صحیح ہو تو جو نظام اسلام نے دیا ہے اس کے بغیر اس قسم کی برائیوں کی روک تھام ممکن نہیں ہے۔

یہ مثبت اقدامات کرنے کے بعد اب اسلام منفی قدم اٹھاتا ہے اور وہ ہے حدود و تعزیرات۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کے باوجود اگر کوئی شخص گندگی میں منہ مارتا ہے' بدکاری میں ملوث ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے' اس کے

اندر گندگی گھر کر چکی ہے۔ لٰہذا ایسے شخص کے لئے سزا بہت سخت ہے۔ یعنی کوئی غیر شادی شدہ مرد یا عورت اس قبیح فعل میں ملوث ہو جائے تو اس کی سزا اسلام نے سو کوڑے رکھی ہے جبکہ شادی شدہ مرد و عورت میں سے کوئی اس کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا رجم یعنی سنگساری ہے۔ غیر شادی شدہ کے لئے عقل و منطق کی رو سے کسی قدر رعایت کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے، کیونکہ اس کے لئے اپنی جبلت کے منہ زور تقاضے کو پورا کرنے کا کوئی جائز راستہ موجود نہیں ہے، لٰہذا ایسا فرد غلط رُخ پر پڑ گیا ہے تو کچھ نرمی کا مستحق ہے۔ چنانچہ ایسے افراد کے لئے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔ لیکن شادی شدہ مرد و عورت کے لئے رجم کی سزا ہے، جس کو دینی اصطلاح میں "حد" کہا جاتا ہے، یعنی ایسے افراد کو برسرعام سنگسار کر دیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رجم کی سزا بہت سخت سزا ہے، لیکن اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ سب سے نمایاں حکمت تو یہ ہے کہ اس سزا سے پورا معاشرہ عبرت پکڑے اور اس قبیح فعل کے ارتکاب سے مجتنب رہے۔ دوسری حکمت یہ نظر آتی ہے کہ شادی شدہ جوڑے میں باہمی محبت و اعتماد کا رشتہ مضبوط رہے۔ تیسری حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حسب و نسب میں خلل واقع نہ ہو۔ البتہ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ زنا کی اتنی ہولناک سزا رکھنے کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ اس فعل قبیح کی شہادت دینے والے چار عینی گواہ موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کو اس طور پر انجام دینا کہ چار چشم دید گواہ بھی موجود ہوں اس فعل کی شناعت و قباحت میں کئی گنا اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ یہ گویا معاشرے کے لئے سرطان کے پھوڑے کی مانند ہے، جس سے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ اس کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسلام کی تاریخ میں رجم کی سزا اقراری مجرموں کو دی گئی ہے۔ یعنی ان افراد کو جن کے ضمیر نے اتنی ملامت کی کہ انہوں نے عذابِ اُخروی سے نجات پانے کے لئے اپنے اس گناہ کا اعتراف کر کے اس دنیا کی سزا قبول کر لی تاکہ وہ اس سزا کے بعد یہیں پاک ہو جائیں اور آخرت کی عقوبت سے بچ سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے جملہ محرکات سے محفوظ و مامون رکھے۔

قتلِ ناحق کی ممانعت

اگلا حکم ارشاد ہوا : ﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ "نہ قتل کرو کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ"۔ یہ الفاظ بڑے قابل غور ہیں۔ انسانی جان بہت محترم ہے۔ انسان کی جان کا ناحق لے لینا' خونِ ناحق بہانا' یہ بہت بڑا جرم ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ترتیب میں تو شرک کے بعد یہی آتا ہے' اس کے بعد زنا کا معاملہ آئے گا۔ اس لئے کہ تمدن کی اصل اساس اور جڑ تو یہی ہے۔ انسان کو جو متمدن حیوان اور Gregarious Animal کہا جاتا ہے تو اس کے تمدن کی جڑ یہی احترامِ جان ہے۔ اگر کسی معاشرے میں ایک دوسرے کی جان کا احترام ہی نہ رہے تو ظاہر بات ہے کہ گویا تمدن کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ دیا گیا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو سورۃ المائدہ میں ہابیل اور قابیل کے واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمائی کہ جس کسی نے ایک انسان کی جان بھی ناحق لی ﴿ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ﴾ "اس نے تو گویا پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا' اور جس نے ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کی جان بچائی"۔ اس لئے کہ حقیقتاً قتلِ ناحق انسانی تمدن کی جڑوں کو کاٹتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ ﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ ﴾ "جس جان کو اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے اس کو قتل نہ کرو۔"

اس کے ساتھ ہی فرمایا : ﴿ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ یہاں استثناء بیان کر دیا گیا کہ "مگر حق کے ساتھ۔" اب یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ "بِالْحَقِّ" سے مراد ہے "قانون کے تحت" جہاں کہیں حق واقع ہو جائے۔ اس حق کے واقع ہونے کی شریعت اسلامی نے چند صورتیں معین کر دی ہیں۔ قتل عمد کی سزا میں ایک صورت یہ ہے کہ قاتل کو قتل کیا جائے۔ اس سزا کی ایک دوسری متبادل صورت بھی ہے جو بعد میں عرض کی جائے گی۔ بہرحال قتل عمد کی سزا کے طور پر کسی قاتل کو قتل کر دینا "اِلَّا بِالْحَقِّ" کی پہلی صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ (جیسا کہ پچھلی آیت کی وضاحت میں بیان کیا گیا) اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کا ارتکاب کرے تو قانونِ اسلامی میں اس کی سزا بھی موت ہے' بلکہ بڑی

بھیانک اور عبرتناک موت جس کو ہم رجم یعنی سنگسار کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں اگر کوئی مسلمان مرتد ہوتا ہے تو اس کی سزا بھی اسلامی قانون میں قتل ہے۔ اور چوتھی شکل ہے حربی کافر کا قتل' یعنی جس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہو چکا ہو۔ کافر اگر ذمی ہے تو وہ اسلامی ریاست کا شہری ہے' اسلامی ریاست نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' اس کی جان بھی اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی بھی مسلمان شہری کی۔ تو یہ چار صورتیں ہیں کسی انسان کی جان لینے کی جن کو شریعت اسلامی نے جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔ انسانی جان کا احترام لازم ہے' انسانی تمدن کی یہی جڑ' بنیاد اور اساس ہے۔

اس کے بعد فرمایا : ﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾ جو شخص ناحق قتل ہوا ہے' یعنی بِالْحَقِّ قتل نہیں ہوا بلکہ قتل ناحق کا شکار ہوا ہے' اس کے ورثاء کو ہم نے ایک اختیار (سلطان) دیا ہے۔ سلطان کے معنی سند اور اختیار کے ہیں۔ بادشاہوں کی طرف سے اگر کوئی فرمان آتا ہے تو وہ بھی سلطان ہے۔ تو یہ سلطان' اللہ کی طرف سے اس مقتول کے ورثاء کو حاصل ہوتا ہے جس کو ناحق قتل کیا گیا ہو۔ اس کے ولی اور اس کے وارث کو قاتل کے سلسلے میں ایک اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ قاتل کی جان لے سکتا ہے۔ گویا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ضمن میں مالک اور مختار بنا دیا جاتا ہے۔ شریعت اسلامی نے اسے یہ قانونی حق دیا ہے۔ قانون کی مشینری اور حکومت کا نظام صرف یہ کریں گے کہ قاتل کو پکڑیں گے۔ اس پر جرم کے اثبات اور ثبوت کے سلسلے میں ساری کارروائی حکومت کے ذمے ہے' لیکن آخری فیصلے کے معاملے میں مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو خون کے بدلے خون لیں' جان کے بدلے جان لیں' اور چاہیں تو جان بخشی کر دیں —— اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں' چاہیں تو احسان کریں اور بغیر کسی معاوضے کے معاف کر دیں اور چاہیں تو خون بہا قبول کر لیں۔ یہ بڑا حکیمانہ قانون ہے' اگرچہ ظاہر ہے کہ کسی قبائلی معاشرے میں اس کا جتنا scope تھا ہمارے جدید معاشرے میں اس کا سکوپ اتنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ قبائلی نظام میں مقتول کے ورثاء کا تعین ہوتا ہے' یہ سارا معاملہ بالکل

کھلا ہوتا ہے' لیکن یہاں اب ہماری شہری سوسائٹی میں تمدن کے اس مرحلہ میں کچھ معاملات اتنے واضح نہیں ہیں جتنے کہ اُس دور میں ہوتے تھے۔ بہرحال اسلامی قانون میں یہ ایک امکان اور متبادل موجود ہے۔ اور واقعتاً جان بخشی کی بڑی برکات ہیں۔ اس لئے کہ اس سے جو انتقامی قتل کا سلسلہ چلا کرتا ہے اس کے رُکنے کے بڑے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک تو واقعہ یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کے زخم پر گویا کہ مرہم رکھا جاتا ہے۔ انہیں اُس وقت ایک عجیب تسکین ہوتی ہے جب انہیں یہ احساس ہو جائے کہ اب قاتل کی جان ہمارے ہاتھ میں ہے' ہم چاہیں تو بخشیں اور چاہیں تو اس کا خون بہادیں۔ یہ اختیار حاصل ہو جانا زخمی دلوں کے لئے اپنے اندر مرہم کی تاثیر لئے ہوئے ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر کسی مقتول کے ورثاء کی طرف سے اتنا بڑا معاملہ ہو جائے کہ قاتل کی جان ان کے قابو میں آنے کے بعد انہوں نے اس کو بخش دیا ہو تو یہ چیز معاشرے کے اندر بڑے صحت مند اور مثبت نتائج پیدا کرنے والی ہے۔ بجائے اس کے کہ دشمنی پر دشمنی اور قتل در قتل کا سلسلہ چلتا جائے یہ چیزیں اس معاملے کے اندر بہت بہتر صورت حال سامنے لاتی ہیں۔ بہرحال یہ ہے قتل نفس کی شناعت اور اہمیت کہ یہ تین سب سے بڑے گناہوں میں سے ہے۔

اس قتل ناحق کے سلسلے میں مقتول کے ورثاء کو بھی ایک ہدایت دی گئی کہ ﴿ فَلَا يُسْرِف فِي الْقَتْلِ ﴾ کہ وہ قتل کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھیں۔ اسراف فی القتل کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس سوسائٹی میں مختلف قبائل مدعی تھے کہ ہماری عزت زیادہ ہے' ہمارے ایک شخص کی جان کسی دوسرے قبیلے کے دو افراد کی جان کے برابر ہے' ہمارا اگر ایک قتل ہوا ہے تو اس قبیلے کے دو افراد قتل کئے جائیں گے۔ یہ اسراف فی القتل کی ایک صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے تو اب وہ خود اسے اذیتیں دے دے کر اور اس کے اعضاء کو ایک ایک کر کے کاٹ کر قتل کریں اور اسے پوری طرح اپنے انتقامی جذبے کا تختہ مشق بنائیں۔ یا یہ کہ خون بہا لے لیا جائے لیکن پھر بھی دلی کدورت ختم نہ ہو' انتقامی جذبات پھر بھی موجود رہیں۔ یا یہ کہ قتل کے بدلے قتل بھی ہو گیا ہے پھر بھی جذبات ٹھنڈے نہیں ہو رہے اور مزید قتل کیلئے دل کے اندر عزائم اور ارادے پروان چڑھ

رہے ہیں۔ یہ ساری صورتیں اسراف فی القتل کی ہیں۔ چنانچہ ﴿ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ﴾ کے زیر عنوان ان سب کا سدِّباب کر دیا گیا۔ آگے فرمایا : ﴿ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ ﴾ اسلامی معاشرہ مقتول کے ورثاء کو مدد دے گا کہ وہ اپنا قصاص اور انتقام حاصل کریں۔ لیکن بہرحال ان کے لئے بھی کچھ حدود ہیں کہ جن کا انہیں پابند ہونا ہے۔

مالِ یتیم کے بارے میں احتیاط کا حکم

اس کے بعد جو اخلاقی ہدایت کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلی چیز آئی ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيْمِ ﴾ "یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو"۔ یہاں بھی وہی انداز ہے جو زنا کے بارے میں آیا کہ ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى ﴾ تو فرمایا : ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ "یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو' سوائے اس طور اور طریقے کے جو بہت ہی اعلیٰ اور بہت ہی عمدہ ہو"۔ اس میں درحقیقت ہدایت دی جارہی ہے اُس معاشرے کو جس میں یہ رواج تھا کہ ایک طرف تو وراثت کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی تھی اور متوفی کا بڑا لڑکا یا بڑے لڑکے پوری کی پوری وراثت پر قابض ہو جاتے تھے۔ تعدّدِ ازدواج تو وہاں موجود تھا۔ اب ہوتا یہ کہ ایک شخص نے ابھی چند سال ہوئے شادی کی ہے' اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اس کی پہلی شادی سے جوان اولاد موجود ہے' اب اس کا جو بھی ترکہ ہے اس پر وہ جوان بیٹے قابض ہو گئے ہیں اور اس کی نابالغ اولاد بالکل محروم ہو گئی ہے' بلکہ محتاج ہو کر معاشرے میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ یا یہ کہ کسی یتیم کا کوئی ولی اور سرپرست ہے اور مختلف بہانوں اور طریقوں سے یتیم کا مال ہڑپ کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کے مال کو ساتھ ملا کر بظاہر تجارت میں یتیم کا مال شامل کر لیا گیا ہے' لیکن مختلف حیلوں بہانوں سے کوشش ہو رہی ہے کہ کسی طرح اس کے مال کو ہڑپ کر لیا جائے۔ تو یہاں اس پس منظر میں ایک بڑی ہی اہم ہدایت دی جارہی ہے کہ مالِ یتیم کو اپنے لئے مطلق حرام جانو' یوں سمجھو کہ یہ آگ ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ قرآن مجید میں آیا بھی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔ (النساء : ۱۰) انہیں جاننا چاہئے کہ اس وقت تو یہ مال بڑا محبوب اور مرغوب نظر آ رہا ہے

لیکن آخرت میں یہ آگ کے انگارے بنیں گے۔ تو یہاں فرمایا کہ یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو مگر بہت ہی اعلیٰ طریقے پر' احتیاط کے ساتھ' اس کی خیر خواہی کرتے ہوئے' اس کے مال کا اپنے آپ کو محافظ جانتے ہوئے۔ ﴿ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ "یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔" اسے اپنے نفع اور نقصان کی خود سمجھ حاصل ہو جائے' اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تو اس صورت میں ظاہر بات ہے کہ وہ تمام مال اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

یہ مالِ یتیم کے سلسلے میں ابتدائی ہدایتیں ہیں۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآن کو سننے اور اسے پڑھنے کا انداز یہ تھا کہ جو احکام اس میں وارد ہوتے تھے وہ ان پر آخری امکانی حد تک عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے ایسے صحابہؓ' جن کے زیر تربیت' زیر کفالت یا زیر سرپرستی کچھ یتیم تھے اور ان کا بھی کچھ مال تھا' انہوں نے اس سلسلے میں انتہائی احتیاط شروع کر دی۔ مثلاً کوئی یتیم ہے اور اس کا باغ ہے' کوئی یتیم ہے اور اس کا بھی کوئی بھیڑوں اور بکریوں کا گلہ ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جو یتیم کا ولی اور سرپرست ہے وہی اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ تو یہاں تک کیا گیا کہ یتیم کی ہنڈیا اس کے مال میں سے علیحدہ پکے گی' تاکہ اس کا مال اور ہمارا مال کہیں مشترک ہانڈی میں جمع ہو کر گڈ مڈ نہ ہو جائے اور مبادا اس کے مال میں سے کوئی بوٹی یا اس کے شوربے میں سے کوئی ایک دو چمچے ہمارے پیٹ میں چلے جائیں۔ اس معاملے میں جب انتہائی شدت اختیار کی گئی تب سورۃ البقرہ میں حکم نازل ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا' اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ احتیاط رکھو' محتاط ہو جاؤ' یتیم کا مال ہڑپ نہ کرو' اپنے آپ کو اس کا امین سمجھو۔ یہاں تک کہ پھر سورۃ النساء میں تفصیلی احکام آئے کہ جب وہ جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دو اور اس پر گواہ بناؤ کہ کیا مال تھا اور کس کس طریقے سے اس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ بڑے تفصیلی احکام ہیں۔ یہاں پر اس کو بھی اسلام کے نظامِ معاشرت میں بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔

ایفائے عہد کی تاکید

اس کے بعد فرمایا : ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ﴾ "اور وعدے کو پورا کرو۔" جب عہد کر لیا ہے تو اسے نبھاؤ‘ وعدہ ہوا ہے تو پورا کرو۔ اور یہاں اس میں تاکید کے لئے فرمایا گیا : ﴿اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝﴾ "عہد کے بارے میں (خدا کے ہاں) باز پرس ہو گی" یہ نہ سمجھو کہ یہ تو ہمارے آپس کے معاملات تھے‘ اللہ کو اس سے کیا تعلق۔ اللہ تو حساب لے اپنے روزوں کا اور اپنی نمازوں کا‘ اپنے احکام کا جو اس نے ہمیں دیئے ہیں۔ اگر ہمارا کوئی معاملہ ہوا ہے اور اس میں اگر ہمارے باہمی معاملات میں اونچ نیچ ہو گئی ہے تو اس کا کوئی تعلق اللہ کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہے‘ بلکہ ﴿اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ عہد کے بارے میں لوگوں کو جواب دہی کرنی ہو گی کہ کیا وعدہ کیا تھا اور اس کا ایفاء کیا یا نہیں کیا؟ اس کو پورا کیا یا نہیں کیا؟ یہ مضمون ہمارے اس منتخب نصاب میں بتکرار و اعادہ آیا ہے۔ آیۂ بِر‘ جو اس منتخب نصاب کے حصہ اول "جامع اسباق" میں سے دوسرا ہی سبق تھا‘ میں بھی فرمایا گیا تھا کہ ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ "اور اپنے عہد کے پورا کرنے والے جبکہ باہم کوئی معاہدہ کر لیں"۔ پھر سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں فرمایا : ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝﴾ "وہ لوگ کہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں" یعنی حفاظت کرنے والے ہیں۔

عہد کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے تو یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے : ((لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ)) کہ جس میں عہد کا پاس نہیں‘ ایفائے عہد کا مادہ نہیں‘ اس کا کوئی دین نہیں۔ اس لئے کہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دین بھی ایک معاہدہ ہے‘ بندے اور رب کے درمیان۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کے متعلق سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا قول و قرار ہے‘ ایک بہت بڑا معاہدہ ہے‘ جو پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس معاہدے کو کیسے نبھاؤ گے اگر چھوٹے چھوٹے وعدے پورے نہیں کر سکتے؟ اگر ایک پیسے میں خیانت کا ارتکاب کر رہے ہو تو ایک کروڑ میں تمہاری امانت پر کیسے اعتماد کیا جائے گا؟ نبی اکرم ﷺ آغازِ وحی سے پہلے کاروبار کرتے تھے لیکن اس

تجارت کے میدان میں حضورؐ نے اپنی شخصیت اور سیرت و کردار کالوہا منوایا۔ آپؐ کہیں معاشرے سے کٹے ہوئے کسی راہب کی خانقاہ اور درگاہ میں زیر تربیت نہیں رہے بلکہ آپ نے زندگی کی منجدھار میں' معاشرے اور سماج کے عین بیچوں بیچ اپنی زندگی بھرپور طریقے سے بسر کی ہے۔ آپ نے نوجوانی کے عالم میں بھیڑیں اور بکریاں بھی چرائیں۔ اسی پر علامہ اقبال نے کہا ہے ؏ "شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!" یہ وہ کام ہے جو تمام انبیاء کرام نے کیا' محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا' اس لئے کہ فطرت سے قریب تر ہونے میں اس کو بڑا دخل ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے عمدہ ترین سطح پر تجارت کی۔ ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص سے کوئی کاروباری گفتگو ہو رہی تھی' ابھی معاہدہ اپنی تکمیلی شکل کو نہیں پہنچا تھا کہ اچانک اسے کوئی کام یاد آ گیا۔ اس نے کہا کہ آپؐ یہاں میرا انتظار کیجئے' میں ابھی آیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں تم ہو آؤ میں تمہارا انتظار یہیں کروں گا۔ وہ شخص چلا گیا اور بعد میں بھول گیا۔ حدیث میں الفاظ آتے ہیں "بَعْدَ ثَلَاثٍ" کہ تین کے بعد اسے یاد آیا۔ اب اندازہ یہی ہے جو اکثر شارحین حدیث نے کہا کہ "بَعْدَ ثَلَاثَۃِ اَیَّامٍ" یعنی تین دن کے بعد یاد آیا۔ اس کے بعد وہ دوڑتا ہوا' ہانپتا ہوا آیا تو اس نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ وہیں موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا : تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ جب اس نے معذرت کی تو حضورؐ نے فرمایا : بہرحال میں اپنے عہد کا پابند تھا' میں تمہیں زبان دے چکا تھا کہ میں یہاں انتظار کروں گا' لہٰذا میں یہاں موجود رہا۔

اسی کو حضورؐ نے فرمایا : ((عِدَۃُ الْمُؤْمِنِ کَاَخْذِ الْکَفِّ)) یعنی مؤمن کا وعدہ تو ایسے ہے جیسے ہاتھ پکڑ لیا گیا ہو۔ اب وہ اس طرح اپنے آپ کو بندھا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو' اسے جکڑ لیا ہو۔ یہ ہے وہ نفسیاتی احساس اور کیفیت جس کی شدت کو انسان اپنے باطن میں محسوس کرے کہ میں زبان دے چکا ہوں' بات ہو چکی ہے' قول و قرار ہو گیا ہے۔ غور کیجئے کہ کسی معاشرے میں اور خاص طور پر کاروبار' لین دین' بیع و شراء اور تجارت میں' اور اس کی پھر جتنی بھی زیادہ ترقی یافتہ اور پیچیدہ صورتیں ہیں' ان سب میں اصل چیز یہی ایفائے عہد ہے۔ بلکہ اس سے معاشرے کے نہ معلوم کتنے پہلوؤں میں اصلاح احوال اور streamlining کی کیفیت ہو جائے گی' بالکل

overhauling کا انداز ہو جائے گا۔ اگر کسی معاشرے میں ایفائے عہد کا رواج ہو جائے اور لوگ واقعتاً اپنے وعدوں کی پابندی کریں اور اس میں جانبین کو یہ اعتماد ہو کہ جو بات ہو رہی ہے وہ یونہی پوری ہوگی تو اندازہ کیجئے کہ اس معاشرے میں کتنا سکون و اطمینان ہوگا اور کتنا کچھ خرچ جو خواہ مخواہ احتیاطی تدابیر کرنے پر ہوتا ہے' وہ نہ ہوگا۔ مثلاً کہیں چار مزدور کام کر رہے ہیں تو ان پر ایک سپروائزر کھڑا کیا جاتا ہے اور ان سپروائزروں پر ایک مزید سپروائزر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سارے غیر ترقیاتی اخراجات ختم ہو سکتے ہیں اگر یہ اطمینان ہو کہ مزدور اپنے اس عہد میں بندھا ہوا کام کرے گا کہ میں نے جو آٹھ گھنٹے کام کرنا طے کیا ہے یہ مجھ پر واجب اور لازم ہے اور اپنی پوری قوتوں کو اس پر انڈیل دینا میرا فرض ہے' اس لئے کہ اس کے بغیر جو اُجرت میں لوں گا وہ میرے لئے جائز اور حلال نہ ہو سکے گی۔ تو اندازہ کیجئے کہ واقعتاً سارے انسانی معاملات کے لئے ایفائے عہد ایک بڑی ہی بنیادی اہمیت کی حامل چیز ہے۔

ناپ تول کو پورا کرنے کی تاکید

ان اوامر و نواہی یعنی do's and dont's کے سلسلے میں اگلا حکم ہے :

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴾ "جب تم ناپو تو پیمانہ پورا کرو اور جب تولو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو"۔ ﴿ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ "یہی بہتر طرزِ عمل ہے اور انجامِ کار کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے"۔ یہ گویا کسی معاشرے میں لینے اور دینے کے باٹ برابر رکھنے کی تاکید ہے۔ اگرچہ اس کا اطلاق وسیع تر پیمانے پر بھی ہو سکتا ہے کہ انسان لینے اور دینے کے پیمانے برابر رکھے اور جن معیارات پر وہ دوسروں کو پرکھتا ہے انہی پر وہ اپنے آپ کو بھی پرکھے' جس ترازو سے وہ دوسروں کو تولتا ہے اسی سے اپنے آپ کو تولے' جس پیمانے سے اپنے آپ کو ناپ رہا ہے اسی سے دوسروں کو ناپے' لیکن یہاں تعین کے طور پر ہمارے انسانی معاشرے میں کاروباری لین دین اور exchange کا جو سلسلہ چلتا ہے اس کے ضمن میں یہ بنیادی ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب ناپ کر دو تو پیمانہ پورا کرو اور تول کر دو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو۔

قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورتوں میں بھی اس سماجی برائی یعنی ذرا سی ڈنڈی مار لینے اور ناپ تول کے اندر کچھ کمی کر دینے پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ گرفت کی گئی ہے۔ سورۃ المُطَفِّفِین کا آغاز ہی ان آیات سے ہوتا ہے : ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○﴾ "ہلاکت و بربادی اور تباہی ہے ان مُطَفِّفِین کے لئے کہ جب ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ناپ کر یا تول کر دوسروں کو دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں"۔ عربی زبان میں "طفّ" کہتے ہیں کسی بہت حقیری شے کو۔ یہاں پر بڑا بلیغ پیرایۂ بیان ہے کہ ڈنڈی تھوڑی سی مار لو گے 'سیر میں آدھی چھٹانک' چھٹانک' تولہ' دو تولہ کی کمی کر لو گے۔ یہ نہایت حقیر اور چھوٹی بات ہے جس کے لئے تم نے اپنی دیانت اور امانت کا سودا کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کا براہ راست تعلق ایمان بالآخرۃ سے ہے۔ گویا تِل کی اوٹ میں پہاڑ ہے۔ تجزیہ تو کرو' یہ ہاتھ کی ذرا سی جنبش بتا رہی ہے' تمہارا ڈنڈی مارنے کا یہ تھوڑا سا عمل اس بات کی پوری غمازی کر رہا ہے کہ تمہیں آخرت کا یقین نہیں' جزاء و سزا کا یقین نہیں' خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین نہیں' خدا کے "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" ہونے کا یقین نہیں' یا خدا کی ہستی کا ہی یقین نہیں۔ بہرحال ایمان کا معاملہ عمل کے ساتھ جس قدر گہرا ربط لئے ہوئے ہے اس کی طرف یہاں اشارہ کر دیا گیا : ﴿أَلَا يَظُنُّ أُولٰئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ○ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾ "کیا انہیں یہ گمان نہیں ہے کہ انہیں اٹھایا جائے گا اس بڑے دن کہ جس دن لوگوں کو اپنے رب العالمین کے حضور کھڑے ہونا ہے۔"

یہ ہے وہ بات جس کو یہاں دہرایا گیا کہ اپنے پیمانے پورے کیا کرو' تولتے ہوئے ڈنڈی سیدھی رکھا کرو۔ فرمایا : ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ "یہ خیر ہے"۔ اس میں بھی ایک اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہر شخص دوسرے کو چور سمجھے اور اس طرح ڈرتے ہوئے اور چوکس و چوکنا رہ کر اس سے معاملہ کرے۔ اس سے معاشرے کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص دوسرے کو چور' خائن اور بددیانت سمجھ رہا ہے۔ اسے یہ اندیشہ ہے کہ ابھی کہیں ڈنڈی مار لی جائے گی' ابھی کہیں ناپ تول میں کمی کر دی جائے گی' ابھی کہیں میری جیب کاٹ لی جائے گی' مجھ پر کوئی ڈاکہ ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ

ناپ تول پورا رکھنے سے ایک طرف تو معاشرے میں اعتماد اور حسن ظن کی فضا ہوتی ہے۔ اور فرمایا ﴿ وَاَحْسَنُ تَاْوِيْلاً ﴾ اور انجامِ کار کے اعتبار سے بھی یہ طرزِ عمل بہت خوب ہے"۔ تم سمجھتے ہو کہ ناپ تول میں کمی کر کے تم نے کچھ بچایا ہے اور چند سکوں کی صورت میں زیادہ نفع کمایا ہے' حالانکہ ایسا نہیں' بلکہ تم مجرم ضمیر لئے ہوئے گھر کو لوٹتے ہو۔ حقیقت میں خیر یہ نہیں' بلکہ خیر تو یہ ہے کہ پورے مطمئن قلب کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹو۔ اللہ تعالیٰ رازق ہے' تمہارا رزق اس کے ذمے ہے' وہ رزق تمہیں بہرطور بہم پہنچائے گا۔

توہمات کی روک تھام

آگے ایک بڑی اہم بات آرہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان معاشرے میں یہ ہدایت بڑی اہمیت کی حامل ہے : ﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ "اس چیز کے پیچھے نہ پڑو کہ جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علمی بنیاد نہیں ہے"۔ حکم دیا جارہا ہے اتباعِ علم کا' یعنی پیروی کرو علم کی' اب ظاہر بات ہے کہ علم یا تو بالحواس ہے۔ ہم نے آنکھوں اور کانوں سے جو کچھ دیکھا اور سنا اس کی بنیاد پر ہم نے کوئی رائے قائم کی' یہ علم ہے۔ علم کا دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ انسان سمع و بصر سے حاصل شدہ معلومات کا اپنے ذہن میں تجزیہ کرتا ہے' اس سے استنتاج کرتا ہے' نتائج اخذ کرتا ہے' ان کو جوڑ کر ان سے کچھ حاصل کرتا ہے' یہ انسان کے ذہن کے تفقہ اور تعقّل کا عمل ہے۔ یہ علم بالعقل ہے۔ مزید برآں اسلام ایک اور ذریعۂ علم' کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اسے علم کے ان دونوں سرچشموں (علم بالحواس اور علم بالعقل) سے بالاتر' زیادہ قابلِ اعتماد' زیادہ یقینی اور زیادہ وثوق واعتماد کے قابل قرار دیتا ہے' اور وہ ہے علم بالوحی۔ بہرحال ذرائع علم یہی تین ہیں اور انہی سے حاصل شدہ معلومات "علم" کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ظن اور قیاس ہے' وہ انکل پچو ہے' وہ تخمینے ہیں' وہ occult sciences کا ایک دائرہ ہے۔ کہیں ہاتھ کی لکیریں لئے بیٹھے ہو' کہیں ستاروں کی چال کے زائچے بنارہے ہو۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کو ان تمام چیزوں سے' ان تمام توہمات سے' ان تمام تخمینات سے بالکل آزاد کر کے اس کے موقف

کی بنیاد اور اس کے عمل کی اساس علم پر قائم کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کے تمدن اور اس کے علمی اور سائنٹیفک ارتقاء کے لئے ایک بڑی ہی اہم ہدایت تھی۔ اور یہ بات تسلیم کی گئی ہے' مستشرقین نے مانا ہے' مغربی مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقتاً دنیا میں توہمات کو ختم کرنے والا اور انسان کے عمل کو علم کی بنیاد پر استوار کرنے والا قرآن مجید ہے۔ زلزلے کے بارے میں ایک قدیم تصور یہ تھا کہ کوئی گائے ہے کہ جس کے سینگوں پر یہ زمین رکھی ہوئی ہے' جب وہ وزن ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے تو زلزلہ آ جاتا ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے؟ کیا سند ہے؟ کس بنیاد پر؟ یہ بات کہی جا رہی ہے؟ جب اس کی سند نہیں تو رد کر دو یا پھر سند لاؤ جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا تھا : "اِیْتُوْنِیْ بِشَیْءٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ حَتّٰی اَقُوْلَ" اگر کوئی چیز ماوراءِ عقل ہے یا ماوراءِ حس ہے تو اس کے لئے کوئی سند اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے فرمودات سے لاؤ' ہم مان لیں گے۔ لیکن اگر نہ وہ سمع و بصر کی گرفت میں آنے والی شے ہو' نہ ہمارے حواس اس کو verify کر سکتے ہوں' نہ وہ ہماری عقل کی میزان میں کسی طور سے پوری اُترتی ہو اور نہ اس کے لئے کوئی اساس اور بنیاد وحی کے علم میں موجود ہو' چاہے وہ وحی متلو ہو یا وحی غیر متلو' یعنی چاہے وہ قرآن ہو یا فرمودۂ نبی ﷺ ہو' ان سب سے باہر کسی بات کو تسلیم کرنے کے لئے ہم تیار نہیں۔ یہ نقطۂ نظر اور انداز ہے جس سے سائنس کے سفر کا آغاز ہوا ہے۔ اور یہ مانا گیا ہے کہ منطق استقرائی (inductive logic) کے موجد مسلمان ہیں اور اس کی طرف متوجہ کرنے والا قرآن ہے ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!!

قرآن اپنے قاری کو متوجہ کرتا ہے کہ یہ آیاتِ الٰہیہ ہیں' ان کو دیکھو اور ان کی مدد سے نتائج اخذ کرو' استقراء سے کام لو' جو سائنس کی بنیاد ہے۔

اسلام سے قبل علم کی بنیاد ارسطو کی استخراجی منطق (deductive logic) پر تھی' اسی پر سارا دارومدار تھا' اسی سے گتھیوں پر گتھیاں بن بھی رہی تھیں اور سلجھ بھی

رہی تھیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سلجھتی کم، اُلجھتی زیادہ تھیں۔ لیکن اسلام نے آکر انسان کو اس منطق کی تنگ نائے سے نکالا اور اسے استخراج (deduction) کی بجائے استقراء (induction) کی طرف متوجہ کیا۔ دیکھئے، کس قدر عمدہ پیرایۂ بیان ہے : ﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡئُوۡلًا۝﴾ تمہیں یہ استعدادات اللہ نے کیوں عطا کی ہیں؟ سماعت دی ہے تاکہ سنو، بصارت دی ہے تاکہ دیکھو، اور تمہارے اندر تفکر و تعقل کی قوتیں رکھی ہیں تاکہ غور و فکر اور سوچ بچار کرو۔ تمہیں استنباط، استدلال اور استنتاج کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ ان سب کے بارے میں تم سے باز پُرس ہو گی کہ انہیں معطل کر کے رکھ چھوڑا تھا اور توہمات پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی تھی یا ان قوتوں اور استعدادات کو استعمال کیا تھا؟ یہ اللہ کی امانتیں ہیں، اللہ کی نعمتیں ہیں، ان کا استعمال کرو۔ ان کے بارے میں تم سے باز پرس ہو گی، محاسبہ ہو گا، پوچھ گچھ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ساری نجومیوں کے انداز میں پیشین گوئیاں، یہ دست شناسی اور اسی نوع کے سارے معاملات، منجموں کے حساب کتاب اور زائچوں کی تیاری، ان کی اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی منجم یا کسی پیشین گوئی کرنے والے کی پیشین گوئی کی تصدیق کرتا ہے تو اس نے اس کی تکذیب کی جو میں لایا ہوں۔ یعنی میری لائی ہوئی تعلیم کچھ اور ہے، اس کی بنیاد علم پر ہے، وہ علم بالحواس بھی ہے، علم بالعقل بھی ہے اور علم بالوحی بھی ہے، چنانچہ ﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡئُوۡلًا﴾ اور اس چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں، جسے تم verify نہیں کر سکتے۔ ہاں ایسی چیزوں کا ایک دائرہ عالم غیب کے امور پر مشتمل ہے جو تمہارے حواس اور تمہاری عقل سے ماوراء ہیں، ان کی verification کے تم پابند نہیں ہو۔ لیکن ان کے ضمن میں جو قابل اعتماد ذریعہ ہے وہ وحی ہے۔ اس سے باہر جس چیز کے لئے کوئی علمی بنیاد نہ ہو اس پر اپنا موقف قائم نہ کرو!

تمکنت اور تکبر کی ممانعت

اس سلسلے میں آخری بات یہ فرمائی گئی : ﴿ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ "اور زمین میں اکڑ کر مت چلو۔" سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں بھی آیا تھا :
﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ دراصل رزائل نفس میں سے سب سے آخر میں انسان کا پیچھا چھوڑنے والی چیز تکبر ہے اور آخری چیز جو انسان کو محاسن اخلاق میں سے میسر آتی ہے وہ تواضع ہے' جو انسانی شخصیت کی پختگی کی سب سے نمایاں علامت ہے۔ لہٰذا سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں بھی اس کا ذکر تھا اور یہاں بھی۔ اتنی کچھ اخلاقی' معاشرتی اور معاشی معاملات میں ہدایات دینے کے بعد اب فرمایا : ﴿ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ "اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔" سورۂ لقمان میں تو اس کے لئے الفاظ آئے تھے : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ ﴾ کیسا دل میں اُتر جانے والا انداز ہے کہ تمہارے رب کو یہ پسند نہیں' وہ اکڑنے والوں' شیخی خوروں' چال میں تمکنت پیدا کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا' انہیں پسند نہیں کرتا۔ یہاں ایک دوسرے رُخ سے بات کی گئی ہے کہ چاہے کتنا اکڑ لو' کتنا پاؤں مار کر چلو' کتنے ہی دندناتے ہوئے چلنے کی کوشش کرو' تم ہماری زمین کو پھاڑ نہیں سکتے۔ ہماری مخلوقات بڑی عظیم ہیں' ہماری یہ کائنات اور اس کی وسعتیں تمہارے تصور اور تخیل سے بھی ماوراء ہیں۔ تم کتنی گردنیں اکڑا لو' کتنے ہی اونچے طرے لگا لو' بہرحال تم پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے : ﴿ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ ﴾ "تم نہ زمین کو پھاڑ سکو گے' نہ بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ پاؤ گے"۔

بندۂ مومن کے لئے آخری دلیل

پھر فرمایا : ﴿ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ﴾ وہی ترغیب (persuation) کا انداز ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کو مانتا ہو تو اس کی ترغیب کے لئے آخری بات یہی ہو گی کہ یہ چیز خدا کو پسند نہیں ہے۔ اگر اپنے رب پر یقین اور ایمان ہے' اگر اس سے محبت ہے اور اگر اس کی رضا جوئی تمہاری زندگی کا نصب العین بن چکی ہے تو

جان لو کہ یہ چیزیں تمہارے رب کو ناپسند ہیں۔ چونکہ یہاں اوامر بھی زیرِ بحث آئے اور نواہی بھی' حکم بھی دیئے گئے اور ردو کا بھی گیا' یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کرو' والدین کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو' قرابت داروں کو ان کا حق ادا کرو اور اگر کہیں مجبوراً ان سے اعراض کرنا ہی پڑ جائے تو ان سے نرمی کی بات کرو' اپنے ہاتھ کو نہ گردن سے باندھ لو نہ بالکل کھلا چھوڑ دو' میانہ روی اختیار کرو' ناحق قتل نہ کرو' زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ تو یہاں اوامر بھی آئے اور نواہی بھی آئے۔ do's بھی ہیں dont's بھی ہیں کہ یہ کرو یہ نہ کرو۔ اس لئے فرمایا : ﴿ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴾ کہ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس میں جو مکروہات ہیں وہ تیرے رب کو بہت ہی ناپسند ہیں' تیرا رب ان کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ بندۂ مومن کے لئے یہ آخری دلیل ہے۔ اب اس کے بعد اس سے قوی تر کوئی اور دلیل ممکن نہیں۔

حکمت و دانائی کی حقیقت

آگے فرمایا : ﴿ ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ ﴾ بڑے پیارے الفاظ ہیں کہ اے محمد ﷺ! یہ حکمت ہے' یہ دانائی ہے' یہ wisdom ہے جو آپ' کے رب نے آپ' پر وحی کی ہے۔ لفظ حکمت کو سمجھنے کے ضمن میں یہ مقام بڑا اہم ہے۔ بعض حضرات نے قرآن مجید کی اُن آیات کی' جن میں نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہارگانہ کا بایں الفاظ ذکر ہے : ﴿ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ ' تفسیر اس طور سے کی ہے کہ کتاب سے مُراد قرآن اور حکمت سے مُراد سُنتِ رسولؐ یا احادیثِ رسولؐ لی ہیں۔ اس خیال کی قرآن مجید کے اس مقام کے حوالے سے تصحیح ضروری ہے۔ قرآن مجید میں احکام بھی ہیں اور قوانین کا بیان بھی ہے' شریعت اور فقہ بھی ہے' اور قرآن مجید ہی میں حکمت و دانائی (wisdom) بھی ہے۔ یہ خود قرآن مجید ہی کے دو رُخ (aspects) ہیں' ایک طرف قانون ہے اور ایک طرف اس قانون کی پشت پر کارفرما دانائی ہے۔ ایک طرف حکم ہے تو دوسری طرف اس حکم کی بنیاد جس حکمت پر قائم ہے' اس کا بیان ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کا اس درس کے دوران

بار بار حوالہ آیا ہے۔ یہ مشابہت اس لفظ حکمت میں بھی موجود ہے۔ وہاں آغاز ہوا تھا :
﴿ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ؕ وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ ﴾ وہاں
نقطۂ آغاز حکمت تھا' جبکہ یہاں اس پوری بحث کا اختتام حکمت کے ذکر پر ہو رہا ہے :
﴿ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰۤی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ؕ ﴾ یہ ہیں وہ باتیں' وہ ہدایات' وہ اوامر
نواہی اور ان کی تعلیم جو کہ تیرے رب نے وحی کی ہیں اے محمد ﷺ آپ پر از
قسم حکمت۔

حرفِ آخر : توحید فی الالوہیت

اس سب کا لُبِّ لباب اور حاصل کیا ہے؟ —— یہ آخری بات "last but not the least" کے درجے میں فرمادی گئی : ﴿ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ ﴾ اللہ کے ساتھ کسی اور کو الٰہ نہ بنالینا۔ یہ وہی بات ہے جو ہمارے کلمۂ طیبہ کا جزوِ اوّل ہے : "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"۔ پس اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ ٹھہرالینا' اللہ کے سوا کسی اور کو الوہیت کا حامل نہ مان بیٹھنا۔ اللہ ہی الٰہ واحد ہے' وہی مطاعِ مطلق ہے' وہی محبوبِ حقیقی ہے۔

اِلٰہ کے لفظ کی تفصیل ہمارے اس منتخب نصاب میں پہلے کہیں نہیں آئی۔ یہ عجیب لفظ ہے۔ اس کے حروفِ اصلی میں' جو اس کا مادہ ہیں' اور پھر اس کے بنیادی لغوی مفاہیم کے اندر جامعیت کا عجیب رنگ ہے۔ "اِلہ" کا مادہ عربی زبان میں کئی معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً "اَلَہَ الفصیلُ الٰی اُمِّہٖ"۔ اونٹنی کا وہ بچہ جو ماں سے دُور کہیں باندھ دیا گیا تھا جب اسے موقع ملتا ہے تو وہ اپنی ماں کی طرف لپکتا ہے۔ اس مفہوم سے یہ لفظ الٰہ اخذ کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس مادے کا ایک مفہوم تحیر ہے۔ یعنی جس کی اصل حقیقت اور کنہ تک کوئی نہ پہنچ پائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ "ولہ" سے ہے جس کا مفہوم والہانہ محبت ہے۔ گویا الٰہ وہ ہستی ہے جس کی طرف کوئی لپکتا ہے اپنی حاجت روائی کے لئے' اپنی مشکل کشائی کے لئے' اپنے مصائب کو دور کرنے کی درخواست لے کر' اپنی ضروریات کی بہم رسانی کی توقع کے ساتھ —— اور تمہارا مشکل کشا' تمہارا حاجت روا' تمہارا روزی رساں اور

تمہاری تکالیف کا دُور فرمانے والا سوائے اللہ کے کوئی نہیں۔ یہ ہے بنیادی تصور الٰہ۔ اس کے بعد یہی لفظ آئے گا اُس ذات کے لئے جو محبت کے قابل ہو' جس سے والہانہ عشق ہو۔ اور وہ ذات بھی اللہ ہی کی ذات ہے۔ وہی محبوبِ حقیقی اور مطلوبِ اصلی ہے۔ اور پھر فلسفیانہ انداز میں بات کی جائے تو وہ ہستی کہ جس کی کنہ کو سمجھنا انسان کے لئے ناممکن ہو' جس کی ذات وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہو' جہاں انسان کے لئے سوائے تحیر کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ یوں سمجھئے کہ یہ جامہ ہر اعتبار سے راست آتا ہے صرف باری تعالیٰ کی ذات پر۔

مختلف مزاج' مختلف شعور کی سطحوں پر فائز' مختلف افتادِ طبع کے لوگ اپنی ذہنی سطح کے مطابق الٰہ کا تصور رکھتے ہیں۔ عوام الناس کے نزدیک الٰہ کا تصور یہی ہے کہ وہ روزی رساں ہے' تکالیف کا دُور کرنے والا ہے' دعائیں سننے والا ہے' تمنائیں برلانے والا ہے۔ ان کی ذہنی سطح پر معبود کا مفہوم یہی ہو گا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" یعنی روزی رساں اس کے سوا کوئی نہیں' مشکل کشا اس کے سوا کوئی نہیں۔ حاجت روا اس کے سوا کوئی نہیں' تکلیفیں دور کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں اور اس کے سوا کوئی نہیں جو لوگوں کی دعائیں سنتا ہو' ان کو قبول کرتا ہو اور ان کی مصیبتوں کو دور فرماتا ہو۔ لیکن فلسفیانہ ذہن اور ہے۔ فلسفیانہ افتاد اور مزاج کا حامل شخص الٰہ کو وہ ہستی مانتا ہے کہ ؏ "اے بروں از وہم و قیل و قالِ من"۔ جہاں انسان کا فکر تھک ہار کر رہ جائے' جس کی ہستی کا تصور ممکن نہ ہو' جس کی صفات کا تصور ممکن نہ ہو' وہ قادر ہے تو کتنا قادر ہے' وہ سمیع ہے تو کتنا سمیع ہے' وہ علیم ہے تو کتنا علیم ہے۔ وہ ذات کہ جہاں پر سوائے تحیر کے انسان کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں وہ ہستی الٰہ ہے۔ اور وہ شخص کہ جو عبادت کی اصل روح سے آشنا ہو چکا ہو' وہ شخص کہ جس کا دل بیدار ہو' اس کی روح زندہ ہو' اس کے لئے الٰہ محبوبِ حقیقی ہے' مطلوبِ اصلی ہے۔ "لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ' لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ' لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ' لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ"۔

اگرچہ اس کلمہ طیبہ کے پہلے جزو کی اس سے بلند تر سطح بھی ہے' لیکن اس کا ذکر یہاں شاید اختصار کے ساتھ مناسب نہ رہے گا' تاہم صرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اس پر

اگرچہ کچھ بحث حقیقت شرک کے ضمن میں ہو چکی ہے کہ ایک مقام وہ بھی ہے جہاں اللہ کے سوا کسی الٰہ کہ نفی کا معاملہ اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ" یعنی وجود حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ حقیقتاً موجود صرف وہ ہے' باقی جو کچھ ہے ؎

کلُّ ما فِی الکون وھمٌ او خیال
او عُکوسٌ فِی المَرایا او ظِلال

جو کچھ نظر آ رہا ہے یا وہ سائے ہیں یا عکس ہیں یا وہ ایک قوتِ واہمہ کی کار فرمائی ہے' جبکہ وجود حقیقی صرف اللہ کا ہے۔

انسان کا فکری ارتقاء ہو' انسان کی روحانی ترقی ہو' ان سب کی معراج یہ ہے کہ انسان اس "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی حقیقت کو پالے۔ لہٰذا یہ ساری بحث و تمحیص اور یہ سارے اوامر و نواہی آخر میں آ کر جس نقطے پر مرتکز ہوتے ہیں وہ نقطہ پھر وہی ہے جہاں سے آغاز ہوا تھا۔ آغاز شرک فی العبادت کی نفی سے ہوا تھا: ﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّاۤ اِیَّاہُ﴾ اور اختتام ہوتا ہے شرک فی الالوہیت کی نفی سے: ﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَتُلْقٰی فِیْ جَھَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا۝﴾ یعنی شرک کا تو ایک ہی نتیجہ نکلے گا۔ اگر تم اس جرم کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہاری حیثیت اس خس و خاشاک اور اس کوڑے کرکٹ کی ہوگی جس کو دیا سلائی دکھادی جائے' جس کو آگ لگادی جائے۔ چنانچہ تم مَلُوْم اور مَدْحُور ہو کر' یعنی ملامت زدہ (condemned) اور دھتکارے ہوئے جہنم میں جھونک دیئے جاؤ گے۔ اس لئے کہ تم شرفِ انسانیت سے تہی ہو گئے ہو۔ اگر تم نے شرک کا ارتکاب کیا تو تم اس منصب اور اس مقام و مرتبے سے اپنے آپ کو محروم کر چکے ہو۔ اگر تم نے توحید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو اب تمہارا مصرف اور مقام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمہیں جلایا جائے اور ابد الآباد تک نارِ جہنم میں جھونک دیا جائے۔

﴿اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا ؕ﴾ جیسا کہ عرض کیا جا چکا' شرک کی ایک شکل' جو اُس معاشرے میں موجود تھی' یہ تھی کہ بنی اسماعیل' مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ تو مزاح کے انداز میں بھی تنقید کی گئی اور کچھ زجر' جھڑکی اور ڈانٹ کے انداز میں اظہارِ ناراضگی

بھی فرمایا گیا کہ کیا تمہارے رب نے تمہیں تو چن لیا ہے بیٹوں کے لئے؟ اگر بیٹی ہو جائے تو تم شرمائے رہتے ہو' منہ چھپائے پھرتے ہو اور تم اس فکر میں ہوتے ہو کہ اسے کہیں گڑھے میں دفن کر آؤ اور جلد سے جلد اس عار اور بدنامی سے کسی نہ کسی طرح رُستگاری اور چھٹکارا حاصل کر لو' اور خدا کے لئے تم نے بیٹیاں ٹھہرائی ہیں۔ تمہاری یہ تقسیم بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا ہے : ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ ﴾ "کیا تمہارے لئے بیٹے ہیں اور اس کے لئے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بڑی ہی نامنصفانہ ہے"۔ یہ تو بڑی ہی عجیب تقسیم ہے جو تم نے کی ہے۔ لیکن اب مزاح کا معاملہ ختم ہوا' اور اس کے بعد فرمایا : ﴿ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝ ﴾ یہ بہت بڑی بات ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ یہی انداز اگلی سورت یعنی سورۂ کہف میں نصاریٰ کے ذکر میں آتا ہے : ﴿ وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ ﴾ یعنی بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان کے اس قول کے اندر کوئی صداقت نہیں ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سرتاسر جھوٹ' تہمت اور بہتان ہے۔ اس پر یہ آیاتِ مبارکہ ختم ہو رہی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان اٹھارہ آیات میں ایک صالح تمدن' نیک اور صحت مند معاشرہ یا یوں کہہ لیجئے کہ اسلامی معاشرہ' اسلامی سوسائٹی اور اسلامی رہن سہن کا بڑا جامع نقشہ سامنے آگیا ہے۔ تاہم اجتماعیت کی وہ سطح جبکہ ملی و ملکی اور سیاسی مسائل سامنے آئیں' ذرا بلند تر سطح ہے' ان سے بحث ان شاء اللہ اگلے درس میں ہوگی۔ اس سطح پر سورۃ الحجرات اجتماعیت کے ضمن میں قرآن مجید کی ہدایت کا ایک بڑا جامع مرقع ہے اور اسی پر ہمارا آئندہ درس مشتمل ہوگا۔ یہاں اس سے کم تر یعنی سماج' معاشرے' سوسائٹی کی سطح پر اسلام کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا' کن چیزوں کو پروان چڑھانا چاہتا ہے اور کن چیزوں کا استیصال اسے منظور ہے' اس کا ایک بڑا جامع نقشہ سامنے آگیا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۝

نظام خلافت کیا ہے؟

- **نظامِ خلافت**، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کے اعلان و اقرار اور قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی کے عملی نفاذ کا نام ہے۔
- **نظامِ خلافت**، اسلامی ریاست کے ہر شہری مسلم ہو یا غیر مسلم، کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔
- **نظامِ خلافت**، اسلامی ریاست کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات یعنی غذا، لباس، رہائش، علاج و تعلیم وغیرہ کا ذمہ دار ہے۔
- **نظامِ خلافت**، تمام کائنات اور انسانوں کے خالق و مالک کے ابدی پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے۔
- **نظامِ خلافت**، اسلامی ریاست کے تمام شہریوں کو فوری عدل و انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے۔
- **نظامِ خلافت**، میں مردوں اور عورتوں کے الگ الگ دائرہ کار معین ہیں۔ یہ نظام عورت کو پورا اختیار دیتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی قائم کردہ ستر و حجاب کی حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے بوقت ضرورت کاروبارِ حیات میں شرکت کر سکے۔
- **نظامِ خلافت**، عورتوں کی عزت و ناموس کا محافظ اور حقوق نسواں کا پاسبان ہے۔
- **نظامِ خلافت**، نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام اس نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنے مقصد حیات سے آگاہ ہوں، بلکہ اس کے مطابق ان کی رہنمائی اور مدد بھی کرتا ہے۔
- **نظامِ خلافت**، مسلمانوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد کی روح بیدار کرنے کا ضامن بھی ہے تاکہ حزب الشیطان کے حملوں کا مؤثر جواب دیا جا سکے۔

خلاصہ کلام :

نظامِ خلافت کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے!

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ